

تبرکات

التبرکات

# التحل

نام آیت ۶۸ کے فقرے **وَأَوْسَىٰ رَبُّكَ إِلَىٰ التَّحْلِ** سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی محض علامت ہے نہ کہ موضوع بحث کا عنوان۔

زمانہ نزول متعدد اندرونی شہادتوں سے اس کے زمانہ نزول پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

آیت ۴۱ کے فقرے **وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا** سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہجرت حبشہ واقع ہو چکی تھی۔

آیت ۱۰۶ **مَنْ كَفَرَ بِلِلَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ** الایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ظلم و ستم پوری شدت کے ساتھ ہو رہا تھا اور یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ناقابلِ برداشت اذیت سے مجبور ہو کر کفر کرے بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے۔

آیات ۱۱۲-۱۱۴ **وَضَوَّبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرِيبًا..... إِنَّ كُفْرَهُمْ إِنَّمَا كَتَبَ اللَّهُ** کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مکہ میں جو زبردست تحفظ رہا ہوا تھا وہ اس سورہ کے نزول کے وقت ختم ہو چکا تھا۔

اس سورہ میں آیت ۱۱۵-۱۱۶ ایسی ہے جس کا حوالہ سورہ انعام آیت ۱۱۹ میں دیا گیا ہے، اور دوسری آیت (۱۱۸) ایسی ہے جس میں سورہ انعام کی آیت ۱۲۶ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں سورتوں کا نزول قریب القرب ہے۔

ان شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس سورہ کے زمانہ نزول بھی کئے کا آخری دور ہی ہے، اور اسی کی تائید سورہ کے عام اندازِ بیان سے بھی ہوتی ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون **شُرک کا ابطال، توحید کا اثبات، دعوتِ پیغمبر کو نہ ماننے کے برے نتائج پر تنبیہ و نمانش، اور حق کی مخالفت و مزاحمت پر زبردستی**۔

**مُجْرِمَاتِ حَرَمِ** سورہ کے آغاز بغیر کسی تمہید کے ایک سخت ایک تنبیہی جملے سے ہوتا ہے۔ کفار مکہ بار بار کہتے تھے کہ جب ہم تمہیں جھٹلا چکے ہیں اور کلمہ کھلا تمہاری مخالفت کر رہے ہیں تو آخر وہ خدا کا غضب لگیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو۔ اس بات کو وہ بالکل تکلیف کلام کی طرح اس لیے دہراتے تھے کہ ان کے نزدیک یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر نہ ہونے کا سب سے زیادہ صریح ثبوت تھا۔ اس

بہ فرمایا کہ جو قوفو اخلا کا عذاب تو تمہارے سر پر تلا کھڑا ہے، اب اس کے ٹوٹ پڑنے کے لیے جلدی نہ مچاؤ بلکہ جو ذرا سی بہت باقی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر بات بچھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد فوراً ہی تفہیم کی تقریر شروع ہو جاتی ہے اور حسب ذیل مضامین بار بار یکے بعد دیگرے سامنے آنے شروع ہوتے ہیں:

(۱) دل لگتے دلائل اور آفاق و انفس کے آثار کی کھلی کھلی شہادتوں سے سمجھایا جاتا ہے کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حق ہے۔

(۲) منکرین کے اعتراضات، شکوک، محبتوں اور حیلوں کا ایک ایک کر کے جواب دیا جاتا ہے۔

(۳) باطل پر اصرار اور حق کے مقابلہ میں استکبار کے بڑے نتائج سے ڈرایا جاتا ہے۔  
(۴) ان اخلاقی اور عملی تغیرات کو مجمل مگر دل نشین انداز سے بیان کیا جاتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین، انسانی زندگی میں لانا چاہتا ہے، اور اس سلسلہ میں مشرکین کو بتایا جاتا ہے کہ خدا کو رب ماننا، جس کا انہیں دعویٰ تھا، محض خالی نولی مان لینا ہی نہیں ہے بلکہ اپنے کچھ تقاضے بھی رکھتا ہے جو عقائد، اخلاق اور عملی زندگی میں نمودار ہونے چاہئیں۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کفار کی مزاحمتوں اور جفا کاریوں کے مقابلہ میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔



سُورَةُ التَّحَلُّ مَكِّيَّةٌ ۱۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَتَىٰ اَهْمُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ۗ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۱  
يُنزِلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهِ ۗ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادٍ ۗ

آگیا اللہ کا فیصلہ اب اس کے لیے جلدی نہ چھاؤ۔ پاک ہے وہ اور بالا اور تر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اس رُوح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل

۱۔ یعنی بن دہ آیا ہی چاہتا ہے۔ اس کے ظہور و نفاذ کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس بات کو صیغہ ماضی میں یا تو اس کے انتہائی یقینی اور انتہائی قریب ہونے کا تصور دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے اس لیے کفار قریش کی کسرتی و بددلی کا پیمانہ لہر لہر ہو چکا تھا اور آخری فیصلہ کن قدم اٹھانے جانے کا وقت آگیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ کیا تھا اور کس شکل میں آیا؟ ہم یہ سمجھتے ہیں (اللہ اعلم بالصواب) کہ اس فیصلے سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت ہے جس کا حکم تھوڑی مدت بعد ہی دیا گیا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی جن لوگوں کے درمیان مبعوث ہوتا ہے ان کے مجرور و انکار کی آخری سرحد پہنچ کر ہی اسے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ حکم ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد یا تو ان پر تباہ کن عذاب آ جاتا ہے، یا پھر نبی اور اس کے متبعین کے ہاتھوں ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جاتی ہے۔ یہی بات تاریخ سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ہجرت جب واقع ہوتی تو کفار مکہ سمجھے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہے۔ مگر آٹھ دس سال کے اندر ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ صرف مکہ سے بلکہ پوری سرزمین عرب ہی سے کفر و شرک کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔

۲۔ پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کا باہمی ربط سمجھنے کے لیے پس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ کفار جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار چیلنج کر رہے تھے کہ اب کیوں نہیں آ جاتا خدا کا وہ فیصلہ جس کے تم ہمیں ڈراؤ سے دیا کرتے ہو؟ اس کے پیچھے دراصل ان کا یہ خیال کار فرما تھا کہ ان کا مشرکانہ مذہب ہی برحق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خواہ مخواہ اللہ کا نام لے لے کر ایک غلط مذہب پیش کر رہے ہیں جسے اللہ کی طرف سے کوئی منظوری حاصل نہیں ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ سے پھر سے ہونے ہوتے اور محمد اس کے پیچھے ہونے نہی ہوتے اور پھر بھی جو کچھ ہم ان کے ساتھ کر رہے ہیں اس پر ہماری شامت نہ آ جاتی۔ اس لیے خدائی فیصلے کا اعلان کرتے ہی فوراً یہ ارشاد ہوا کہ اس کے نفاذ میں تاخیر کی وجہ ہرگز وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اللہ اس سے بلند تر اور پاکیزہ تر ہے کہ کوئی اس کا



أَنْ أَنْذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ۝ خَلَقَ  
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ تَعْلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

فرمادیتا ہے (اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) ”آگاہ کر دو، میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے،  
لہذا تم مجھی سے ڈرو۔“ اُس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے، وہ بہت بالا و برتر ہے اُس شرک  
سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

شریک ہو۔

۳۷ یعنی روح نبوت کو جس سے بھر کر نبی کام اور کلام کرتا ہے۔ یہ وحی اور یہ پیغمبرانہ اسپرٹ چونکہ اخلاقی زندگی میں وہی  
مقام رکھتی ہے جو طبعی زندگی میں روح کا مقام ہے، اس لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اس کے لیے روح کا لفظ استعمال کیا  
گیا ہے۔ اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائیوں نے روح القدس (Holy) کو تین خداؤں میں سے  
ایک خدا بنا ڈالا۔

۳۸ فیصلہ طلب کرنے کے لیے کفار جو چیلنج کر رہے تھے اس کے پس پشت چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی  
نبوت کا انکار بھی موجود تھا، اس لیے شرک کی تردید کے ساتھ اور اس کے معاً بعد آپ کی نبوت کا اثبات فرمایا گیا۔ وہ کتنے تھے  
کہ یہ بنا دٹی باتیں ہیں جو یہ شخص بنا رہا ہے۔ اللہ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ نہیں، یہ ہماری بھیجی ہوئی روح ہے جس سے لبریز  
ہو کر یہ شخص نبوت کر رہا ہے۔

پھر یہ جو فرمایا کہ اپنے جس بندے پر اللہ چاہتا ہے یہ روح نازل کرنا ہے، تو یہ کفار کے اُن اعتراضات کا جواب ہے  
جو وہ حضور پر کرتے تھے کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا تو کیا بس محمد بن عبد اللہ ہی اس کام کے لیے رہ گیا تھا، کئے اور طاقت کے  
سارے بڑے بڑے سردار مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی پر بھی نگاہ نہ پڑ سکی! اس طرح کے بیہودہ اعتراضات کا جواب اس کے  
سوا اور کیا ہو سکتا تھا، اور یہی متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے کہ خدا اپنے کام کو خود جانتا ہے، تم سے مشورہ لینے کی حاجت  
نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے آپ ہی اپنے کام کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔

۳۹ اس فقرے سے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ روح نبوت جہاں جس انسان پر بھی نازل ہوتی ہے یہی ایک دعوت  
لے کر آئی ہے کہ خدائی صرف ایک اللہ کی ہے اور بس وہی اکیلا اس کا مستحق ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے۔ کوئی دوسرا اس لائق  
نہیں کہ اس کی ناراضگی کا خوف، اس کی سزا کا ڈر، اور اس کی نافرمانی کے نتائج بد کا اندیشہ انسانی اخلاق کا لنگر اور انسانی فکرو عمل  
کے پورے نظام کا محور بن کر رہے۔

۴۰ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات جس کی دعوت خدا کے پیغمبر دیتے

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿۴﴾ وَالْأَنْعَامَ  
خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۵﴾ وَلَكُمْ  
فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴿۶﴾ وَتَحْمِلُ أَوْثَانَكُمْ  
إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بِلِغِيهِ إِلَّا بَشِيقَ الْأَنْفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ

اُس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑا ہوتی بن گیا۔ اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ اُن میں تمہارے لیے جمال ہے جب کہ صبح تم انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو اور جبکہ شام انہیں واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے لیے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب

ہیں، اسی کی شہادت زمین و آسمان کا پورا کارخانہ تخلیق دے رہا ہے۔ یہ کارخانہ کوئی خیالی گورکھ دھندہ نہیں ہے، بلکہ ایک سراسر مبنی حقیقت نظام ہے۔ اس میں تم جس طرف چاہو دنگا، اٹھا کر دیکھ لو، شرک کی گواہی کہیں سے نہ ملے گی، اللہ کے سوا دوسرے کی خدائی کہیں حلیتی نظر نہ آئے گی، کسی چیز کی ساخت یہ شہادت نہ دے گی کہ اس کا وجود کسی اور کا بھی رہیں منت ہے۔ پھر جب یہ بھوس حقیقت پر بنا ہوا نظام خالص توحید پر چل رہا ہے تو آخر تمہارے اس شرک کا سکہ کس جگہ رواں ہو سکتا ہے جبکہ اس کی تینیں وہم و گمان کے سوا اذیت کا شائبہ تک نہیں ہے؟ — اس کے بعد آثار کائنات سے اور خود انسان کے اپنے وجود سے وہ شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو ایک طرف توحید پر اور دوسری طرف رسالت پر دلالت کرتی ہیں۔

کے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے نطفے کی حقیر سی بوند سے وہ انسان پیدا کیا جو بحث و استدلال کی قابلیت رکھتا ہے اور اپنے مدعا کے لیے جھٹتیں پیش کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس انسان کو خدا نے نطفے جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا ہے، اس کی خودی کا طغیان تو دیکھو کہ وہ خود خدا ہی کے مقابلہ میں جھگڑنے پر اتر آیا ہے۔ پہلے مطلب کے لحاظ سے یہ آیت اسی استدلال کی ایک کڑی ہے جو آگے مسلسل کئی آیتوں میں پیش کیا گیا ہے (جس کی تشریح ہم اس سلسلہ بیان کے آخر میں کریں گے)۔ اور دوسرے مطلب کے لحاظ سے یہ آیت انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے سے پہلے ذرا اپنی ہستی کو دیکھو۔ کس شکل میں تو کہاں سے نکل کر کہاں پہنچا، کس جگہ تو نے ابتداء پرورش پائی، پھر کس راستے سے تو رہ آمد ہو کر دنیا میں آیا، پھر کن مرحلوں سے گزرنا ہوا تو جوانی کی عمر کو پہنچا اور اب اپنے

لَرَوِّفٌ رَّحِيمٌ ۝ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً  
وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ

بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔ اُس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ اور بہت سی چیزیں (تمہارے فائدے کے لیے) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے۔ اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔

آپ کو بھول کر تو کس کے منہ آ رہا ہے۔

۷ یعنی بکثرت ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی بھلائی کے لیے کام کر رہی ہیں اور انسان کو خبر تک نہیں ہے کہ کہاں کہاں کتنے خدام اُس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور کیا خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۸ توحید اور رحمت درلودہیت کے دلائل پیش کرتے ہوئے یہاں اشارۃً نبوت کی بھی ایک دلیل پیش کر دی گئی ہے۔ اس دلیل کا مختصر بیان یہ ہے:

دنیا میں انسان کے لیے فکر و عمل کے بہت سے مختلف راستے ممکن ہیں اور عملاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے راستے بیک وقت تو حق نہیں ہو سکتے۔ سچائی تو ایک ہی ہے اور صحیح نظریہ حیات صرف وہی ہو سکتا ہے جو اُس سچائی کے مطابق ہو۔ اور عمل کے بے شمار ممکن راستوں میں سے صحیح راستہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو صحیح نظریہ حیات پر مبنی ہو۔

اس صحیح نظریے اور صحیح راہ عمل سے واقف ہونا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے، بلکہ اصل بنیادی ضرورت یہی ہے۔ کیونکہ دوسری تمام چیزیں تو انسان کی صرف اُن ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جو ایک اور چنے درجے کا جانور ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہے۔ یہ اگر پوری نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کی ساری زندگی ہی ناکام ہو گئی۔

اب غور کرو کہ جن خدائے تمہیں وجود میں لانے سے پہلے تمہارے لیے یہ کچھ سرو سامان مہیا کر کے رکھا اور جس نے وجود میں لانے کے بعد تمہاری حیوانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا اتنی دقیقہ سنجی کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر انتظام کیا، کیا اس سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ اس نے تمہاری انسانی زندگی کی اس سب سے بڑی اور اصل ضرورت کو پورا کرنے کا بندوبست نہ کیا ہوگا؟

یہی بندوبست تو ہے جو نبوت کے ذریعہ سے کیا گیا ہے۔ اگر تم نبوت کو نہیں مانتے تو بتانا کہ تمہارے خیال میں خدا انسان کی ہدایت کے لیے اور کونسا انتظام کیا ہے؟ اس کے جواب میں تم نہ یہ کہہ سکتے ہو کہ خدا نے ہمیں راستہ تلاش کرنے کے لیے عقل دیا تو اسے رکھی ہے، کیونکہ انسانی عقل دیکر پہلے ہی بے شمار مختلف راستے ایجاد کر بیٹھی ہے جو راہ راست کی

وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ۝۱ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ  
مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ نَبْعٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۝۲ يُثْبِتُ  
لَكُمْ بِهِ الشَّرَاعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ  
الثَّمَرَاتِ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝۱۱

اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ ع

وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو  
اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعہ سے کھیتیاں اگاتا ہے  
اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی  
ہے اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

صحیح دریافت میں اس کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے۔ اور تم یہی کہہ سکتے ہو کہ خدا نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے،  
کیونکہ خدا کے ساتھ اس سے بڑھ کر بدگمانی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ جانور ہونے کی حیثیت سے تو تمہاری پرورش اور  
تمہارے نشوونما کا اتنا مفصل اور مکمل انتظام کرے، مگر انسان ہونے کی حیثیت سے تم کو یونہی تارکیوں میں بھٹکنے اور  
شکر کو پس کھانے کے لیے چھوڑ دے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو صوالرحمن، ماسشبیہ ۲-۳)

۱۱ یعنی اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس ذمہ داری کو (جو نوع انسان کی رہنمائی کے لیے اس نے  
خود اپنے اوپر عائد کی ہے) اس طرح ادا کرنا کہ سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر دوسری تمام بے اختیار مخلوقات کے  
مانند برسر ہدایت بنا دیتا۔ لیکن یہ اس کی مشیت کا تقاضا نہ تھا۔ اُس کی مشیت ایک ایسی ذی اختیار مخلوق کو وجود میں  
لانے کی متقاضی تھی جو اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے صحیح اور غلط، ہر طرح کے راستوں پر جانے کی آزادی رکھتی ہو۔ اسی  
آزادی کے استعمال کے لیے اس کو علم کے ذرائع دیے گئے، عقل و فکر کی صلاحیتیں دی گئیں، خواہش اور ارادے کی طاقتیں  
بخشی گئیں، اپنے اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرف کے اختیارات عطا کیے گئے، اور باطن و ظاہر میں ہر طرف بے شمار  
ایسے اسباب رکھ دیے گئے جو اس کے لیے ہدایت اور ضلالت، دونوں کے موجب بن سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بے معنی  
ہو جاتا اگر وہ پیدائشی طور پر راست رو بنا دیا جاتا۔ اور ترقی کے اُن بلند ترین مدارج تک بھی انسان کا پہنچنا ممکن نہ رہتا  
جو صرف آزادی کے صحیح استعمال ہی کے نتیجے میں اس کو مل سکتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے



وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٌ  
 بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۳﴾ وَمَا ذَرَأَا لَكُمُ  
 فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ  
 يَتَذَكَّرُونَ ﴿۱۴﴾ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا  
 طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حَبْلًا مِّنْ حَبْلٍ مَّوَدَّنٍ وَتَرَى الْفُلَ لَئِن  
 مَّوَّاجَرَفِيهِ وَتَتَّبَعُوا مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۵﴾

اُس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اُسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں، ان میں بھی ضرور نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تروتازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زمینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔

جبری بدایت کا طریقہ چھوڑ کر رسالت کا طریقہ اختیار فرمائیے تاکہ انسان کی آزادی بھی برقرار رہے، اور اس کے امتحان کا منشا بھی پورا ہو، اور راہِ راست بھی معقول ترین طریقہ ہے اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔  
 اللہ یعنی حلال طریقوں سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَ سُبُلًا  
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥﴾ وَعَلَّمَتِ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴿١٦﴾

اُس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں، اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔

۱۶ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سطح زمین پر پہاڑوں کے اجماع کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کی گڑبگڑ اور اس کی رفتار میں انضباط پیدا ہوتا ہے۔ قرآنی مجید میں متعدد مقامات پر پہاڑوں کے اس فائدے کو نمایاں کر کے بتایا گیا ہے جس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے تمام فائدے ضمنی ہیں اور اصل فائدہ یہی حرکت زمین کو اضطراب سے بچا کر منضبط (Regulate) کرنا ہے۔

۱۷ یعنی وہ راستے جو زمینی نالوں اور دریاؤں کے ساتھ بنتے چلے جاتے ہیں۔ ان قدرتی راستوں کی اہمیت خصوصیت کے ساتھ پہاڑی علاقوں میں محسوس ہوتی ہے، اگرچہ میدانی علاقوں میں بھی وہ کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

۱۸ یعنی خدا نے ساری زمین بالکل یکساں بنا کر نہیں رکھی بلکہ ہر خطے کو مختلف امتیازی علامات (Landmarks) سے ممتاز کیا۔ اس کے بہت سے دوسرے فوائد کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے راستے اور اپنی منزل مقصود کو الگ پہچان لیتا ہے۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اسی وقت معلوم ہوتی ہے جبکہ اسے کمی ایسے ریگستانی علاقوں میں جانے کا اتفاق جو ابوجہاں اس طرح کے امتیازی نشانات تقریباً مفقود ہوتے ہیں اور آدمی ہر وقت بھٹک جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے اس سے بھی بڑھ کر بکری سفوف آدمی کو اس عظیم الشان نعمت کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ وہاں نشانات راہ بالکل ہی مفقود ہوتے ہیں۔ لیکن صحراؤں اور سمندروں میں بھی اللہ نے انسان کی رہنمائی کا ایک فطری انتظام کر رکھا ہے اور وہ بین تارے جنہیں دیکھ دیکھ کر انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک اپنا راستہ معلوم کر رہا ہے۔

بیابان پھر توحید اور رحمت و ربوبیت کی دلیلوں کے درمیان ایک لطیف اشارہ و دلیل رسالت کی طرف کر دیا گیا ہے۔ اس مقام کو بڑھتے ہوئے ذہنی خود بخود اس مضمون کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ جس خدا نے تمہاری مادی زندگی میں تمہاری رہنمائی کے لیے یہ کچھ انعطافات کیے ہیں کیا وہ تمہاری اخلاقی زندگی سے آٹنا ہے پروا ہو سکتا ہے کہ بیابان تمہاری ہدایت کا کچھ بھی انتظام نہ کرے؟ ظاہر ہے کہ مادی زندگی میں بھٹک جانے کا بڑے سے بڑا نقصان بھی اخلاقی زندگی میں بھٹکنے کے نقصان سے بدرجہا کم ہے۔ پھر جس رب رحیم کو ہماری مادی فلاح کی اتنی فکر ہے کہ پہاڑوں میں ہمارے لیے راستے بناتا ہے، میدانوں میں نشانات راہ کھڑے کرتا ہے، صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو صحیح سمت سفر بتانے کے لیے آسمانوں پر قندیں لیس روشن کرتا ہے، اس سے

اَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ اَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۵﴾ وَاِنْ

پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، دونوں یکساں ہیں؟ کیا تم ہوش میں نہیں آتے اگر تم

یہ بدگمانی کیسے کی جاسکتی ہے کہ اس نے ہماری اخلاقی فلاح کے لیے کوئی راستہ نہ بنایا ہوگا، اس راستے کو نمایاں کرنے کے لیے کوئی نشان نہ کھڑا کیا ہوگا، اور اُسے صاف صاف دکھانے کے لیے کوئی سراچ نہیں روٹھیں نہ کیا ہوگا؟

۱۵ یہاں تک آفاق اور انفس کی بہت سی نشانیاں جو پہلے در پہلے بیان کی گئی ہیں ان سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود

ہے کہ انسان اپنے وجود سے لے کر زمین اور آسمان کے گوشے گوشے تک جو ہر جگہ ہے، ہر چیز پر غیر کے بیان کی تصدیق کر رہی ہے اور کہیں سے بھی شرک کی اور ساتھ ساتھ دہریت کی بھی۔ تاہم یہاں کوئی شہادت فراہم نہیں ہوتی۔ یہ ایک خیر بوند سے بولتا جالتا اور حجت و استدلال کرتا انسان بنا کھڑا کرنا۔ یہ اُس کی ضرورت کے عین مطابق بہت سے جانور پیدا کرنا جن کے بال اور کھال، بخون اور دودھ، گوشت اور پیٹھ، ہر چیز میں انسانی فطرت کے بہت سے مطالبات کا اسی کہ اس کے ذوق جمال کی مانگ تک کا جواب موجود ہے۔ یہ آسمان سے بارش کا انتظام، اور یہ زمین میں طرح طرح کے پھولوں اور غلوں اور چاروں کی روئیدگی کا انتظام، جس کے بے شمار شعبے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کھاتے چلے جاتے ہیں اور پھر انسان کی بھی فطری ضرورتوں کے عین مطابق ہیں۔ یہ رات اور دن کی باقاعدہ آمد و رفت، اور یہ چاند اور سورج اور تاروں کی انتہائی منظم حرکات، جن کا زمین کی پیداوار اور انسان کی مصلحتوں سے آنا گہرا ربط ہے۔ یہ زمین میں سمندروں کا وجود اور یہ اُن کے اندر انسان کی بہت سی طبعی اور جمالی طلبوں کا جواب۔ یہ پانی کا چند مخصوص قوانین سے جکڑا ہوا ہونا، اور پھر اس کے یہ فائدے کہ انسان سمندر جیسی ہولناک چیز کا سینہ چیرتا ہوا اس میں اپنے جہاز چلاتا ہے اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر اور تجارت کرنا پھرتا ہے۔ یہ دھرتی کے سینے پر پہاڑوں کے اُبھار اور یہ انسان کی ہستی کے لیے اُن کے فائدے۔ یہ سطح زمین کی ساخت سے لے کر آسمان کی بلند فضاؤں تک بے شمار علامتوں اور امتیازی نشانیوں کا پھیلاؤ اور پھر اس طرح ان کا انسان کے لیے مفید ہونا۔ یہ ساری چیزیں صاف شہادت دے رہی ہیں کہ ایک ہی ہستی نے یہ منصوبہ سوچا ہے، اُسی نے اپنے منصوبے کے مطابق ان سب کو ڈیزائن کیا ہے، اُسی نے اس ڈیزائن پر ان کو پیدا کیا ہے، وہی برکن اس دنیا میں نت نئی چیزیں بنا بنا کر اس طرح لا رہا ہے کہ مجموعی اسکیم اور اس کے نظم میں ذرا فرق نہیں آتا، اور وہی زمین سے لے کر آسمانوں تک اس عظیم الشان کارخانے کو چلا رہا ہے۔ ایک جو قوت یا ایک ہٹ دھرم کے سوا اور کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک اتفاقی حادثہ ہے؟ یا یہ کہ اس کمال درجہ منظم اور مناسبت کا نشات کے مختلف کام یا مختلف اجزاء مختلف خداؤں کے آفرینہ اور مختلف خداؤں کے زیر انتظام ہیں؟

۱۶ یعنی اگر تم یہ مانتے ہو (جیسا کہ فی الواقع کفار مکہ بھی مانتے تھے اور دنیا کے دوسرے مشرکین بھی مانتے ہیں)

کہ خالق اشد ہی ہے اور اس کا نشات کے اندر تمہارے ٹھیرانے ہوئے شرکیوں میں سے کسی کا کچھ بھی پیدا کیا ہوا نہیں ہے



تَعَدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ  
مَا تُسْرُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا  
يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ وَاَنْتُمْ غَيْرَ اَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ

اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے، حالانکہ وہ تمہارے کھلے سے بھی واقف ہے اور چھپے سے بھی۔

اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ

تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ خالق کے خلق کیسے ہوئے نظام میں غیر خالق ہستیوں کی حیثیت خود خالق کے برابر یا کسی طرح بھی اُس کے مانند ہو، کیونکہ ممکن ہے کہ اپنی خلق کی ہونی کا ثبات میں جو اختیارات خالق کے ہیں وہی ان غیر خالقوں کے بھی ہوں، اور اپنی مخلوق پر جو حقوق خالق کو حاصل ہیں وہی حقوق غیر خالقوں کو بھی حاصل ہوں، کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ خالق اور غیر خالق کی صفات ایک جیسی ہوں گی، یا وہ ایک جنس کے افراد ہوں گے، حتیٰ کہ ان کے درمیان باپ اور اولاد کا رشتہ ہوگا؟

۱۷ پہلے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک پوری داستان اُن کی چھوڑ دی ہے، اس لیے کہ وہ اس قدر عیاں ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ اس کی طرف محض یہ لطیف اشارہ ہی کافی ہے کہ اللہ کے بے پایاں احسانات کا ذکر کرنے کے معاً بعد اس کے غفور و رحیم ہونے کا ذکر کر دیا جائے۔ اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جس انسان کا بال بال اللہ کے احسانات میں بندھا ہوا ہے وہ اپنے عمن کی نعمتوں کا جواب کیسی کیسی نیک حرامیوں، بے دغائیوں، غداروں اور سرکشوں سے دے رہا ہے، اور پھر اس کا عمن کیسے رحیم اور عظیم ہے کہ ان ساری حرکتوں کے باوجود وہ سالہا سال ایک نیک حرام شخص کو اور صد ہا برس ایک باغی قوم کو اپنی نعمتوں سے نوازتا چلا جاتا ہے۔ یہاں وہ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو علانیہ خالق کی ہستی ہی کے منکر ہیں اور پھر بھی نعمتوں سے مالا مال ہوئے جارہے ہیں۔ وہ بھی پائے جاتے ہیں جو خالق کی ذات، صفات، اختیارات، حقوق، سب میں غیر خالق ہستیوں کو اس کا شریک ٹھہرا رہے ہیں اور منعم کی نعمتوں کا شکر یہ غیر منعموں کو ادا کر رہے ہیں، پھر بھی نعمت دینے والا ہاتھ نعمت دینے سے نہیں روکتا۔ وہ بھی ہیں جو خالق کو خالق اور منعم ماننے کے باوجود اس کے مقابلے میں سرکشی و نافرمانی ہی کو اپنا شیوہ اور اس کی اطاعت سے آزادی ہی کو اپنا مسلک بنائے رکھتے ہیں، پھر بھی مدت العمر اس کے بے حد حساب احسانات کا سلسلہ اُن پر جاری رہتا ہے۔

۱۸ یعنی کوئی احمق یہ نہ سمجھے کہ انکار خدا اور شرک اور معصیت کے باوجود نعمتوں کا سلسلہ بند نہ ہونا کچھ

آيَانَ يُبْعَثُونَ ﴿١٩﴾ إِلَهُكُمْ إِلَهًُا وَاحِدًا ۚ فَالَّذِينَ لَا  
يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ﴿٢٠﴾  
لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۗ إِنَّهُ

انہیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔ ع

تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے اُن کے دلوں میں انکار پس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں۔ اللہ یقیناً ان کے سب کرتوت جانتا ہے چھپے ہوئے بھی اور کھلے ہوئے بھی۔ وہ

اس وجہ سے ہے کہ اللہ کو لوگوں کے کرتوتوں کی خبر نہیں ہے۔ یہ کوئی اندھی بانٹ اور غلط فہمی نہیں ہے جو بے خبری کی وجہ سے ہو رہی ہو۔ یہ تو وہ علم اور درگزر ہے جو مجرموں کے پوشیدہ اسرار بلکہ دل کی چھپی ہوئی نیتوں تک سے واقف ہونے کے باوجود کیا جا رہا ہے، اور یہ وہ فیاضی و عالی ظرفی ہے جو صرف رب العالمین ہی کو زیب دیتی ہے۔

۱۹ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور پر جن بناوٹ موجودوں کی تردید کی جا رہی ہے وہ فرشتے، یاجن، یا شیاطین، یا لکڑی پتھر کی سورتیاں نہیں ہیں، بلکہ اصحاب قبور ہیں۔ اس لیے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں، ان پر آمواتٌ عَیْرٌ أَحْيَا کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور لکڑی پتھر کی سورتیوں کے معاملہ میں بحث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے، اس لیے مَا يَشْعُرُونَ آيَانَ يُبْعَثُونَ کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ سے مراد وہ انبیاء، اولیاء، شہدا، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین دانا، مشکل کشا، فریادرس، غریب نواز، گنج بخش، اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حیات روانی کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اس نوعیت کے مجبور نہیں پائے جاتے تھے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیت عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ کون پڑھا لکھا نہیں جانتا ہے کہ عرب کے متعدد قبائل، ربیعہ، کلب، تغلب، قضا، کنانہ، خزت، کعب، کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے، اور یہ دونوں مذاہب بڑی طرح انبیاء اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے پھر مشرک عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے مجبور وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنہیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ دود، سواع، یغوث، یعوق، نسر، یہ سب صالحین کے نام ہیں جنہیں بعد کے لوگ بت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ اسات اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات ملات اور مناة اور عترتی کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عترتی اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ

لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِلَّا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ۝ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ

اُن لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرور و نفس میں مبتلا ہوں۔

اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو کہتے ہیں ”اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں“۔ یہ باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ساتھ ساتھ کچھ اُن لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنہیں یہ بر بنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ دیکھو ایسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر لے رہے ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ (حق کو) نیچا دکھانے کے لیے ایسی ہی مکاریاں کر چکے ہیں، تو دیکھ لو کہ اللہ نے اُن کے مکر کی عمارت جڑ سے

میاں جاڑا لات کے ہاں اور گری عجزی کے ہاں بسر کرتے تھے، مَبْنُوتًا وَتَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ۔

۲۰ یعنی آخرت کے انکار نے اُن کو اس قدر غیر ذمہ دار بنے مکرو اور دنیا کی زندگی میں مست بنا دیا ہے کہ اب انہیں کسی حقیقت کا انکار کر دینے میں باک نہیں رہا، کسی صداقت کی ان کے دل میں قدر باقی نہیں رہی، کسی اخلاقی بندش کو اپنے نفس پر برداشت کرنے کے لیے وہ تیار نہیں رہے، اور انہیں یہ تحقیق کرنے کی پروا ہی نہیں رہی کہ جس طریقے پر وہ چل رہے ہیں وہ حق ہے یا نہیں۔

۲۱ یہاں سے تقریر کا رخ دوسری طرف پھرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلہ میں جو مشرکین کفار مسکد کی طرف سے ہو رہی تھیں، جو جنتیں آپ کے خلاف پیش کی جا رہی تھیں، جو جیلے اور بہانے ایمان نہ لانے کے لیے گھڑے جا رہے تھے، جو اعتراضات آپ پر وارد کیے جا رہے تھے، ان کو ایک ایک کر کے لیا جاتا ہے اور ان پر فحاشی، زبرد اور نصیحت کی جاتی ہے۔

۲۲ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا جب اطراف و اکناف میں پھیلا تو کئے کے لوگ جہاں کہیں جاتے تھے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارے ہاں جو صاحب ہی بن کر اُٹھے ہیں وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات کا جواب کفار مکہ ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیتے تھے جن سے

مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ  
 مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِبُهُمْ وَ يَقُولُ  
 ابْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُشَاقِقُونَ فِيهِمْ قَالَ الَّذِينَ  
 أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۳۲﴾ الَّذِينَ  
 تَتَوَقَّعُهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي الْأَنْفُسِ فَأَلْقُوا السَّلَامَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ

اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اوپر سے ان کے سر پر آ رہی اور ایسے رُخ سے ان پر عذاب آیا جہاں  
 سے اس کے آنے کا اُن کو گمان تک نہ تھا۔ پھر قیامت کے روز اللہ انہیں ذلیل و خوار کرے گا  
 اور اُن سے کہے گا "بتاؤ اب کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے لیے تم (اہل حق سے) جھگڑے  
 کیا کرتے تھے؟"۔ جن لوگوں کو دنیا میں علم حاصل تھا وہ کہیں گے "آج رسوائی اور بدبختی ہے  
 کافروں کے لیے"۔ ہاں انہی کافروں کے لیے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں  
 گرفتار ہوتے ہیں تو (سرکش چھوڑ کر) فوراً ڈگس ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ہم تو کوئی قصور نہیں

سائل کے دل میں ہی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب کے متعلق کوئی نہ کوئی شک بیٹھے جائے یا کم از کم اس کو آپ سے  
 اور آپ کی نبوت کے معاملے سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہے۔

۳۱۔ پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑے غور و فکر سے خود  
 بھر سکتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ سوال کہے گا تو سارے میدانِ حشر میں ایک ستانا چھا جائے گا  
 کفار و مشرکین کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ اُن کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ اس لیے وہ دم بخود رہ جائیں گے  
 اور اہل علم کے درمیان آپس میں یہ باتیں ہوں گی۔

۳۲۔ یہ فقرہ اہل علم کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ خود بطور تشریح فرما رہا ہے جن لوگوں  
 نے اسے بھی اہل علم ہی کا قول سمجھا ہے انہیں بڑی تاویلوں سے بات بتانی پڑی ہے اور پھر بھی بات پوری نہیں  
 بن سکی ہے۔

۳۵۔ یعنی جب موت کے وقت ملائکہ ان کی رُو جس ان کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں۔



مِنْ سُوءٍ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۸﴾ فَادْخُلُوا  
أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَلَيْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿۳۹﴾

کر رہے تھے۔ ملائکہ جواب دیتے ہیں "کر کیسے نہیں رہے تھے! اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے۔ اب جاؤ، جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ۔ وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے" پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے تکبروں کے لیے۔

۳۸۔ یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت، جس میں قبض روح کے بعد منقیوں اور ملائکہ کی گفتگو کا ذکر ہے، قرآن مجید کی ان متعدد آیات میں سے ہے جو صریح طور پر عذاب و ثواب فی ثبوت دیتی ہیں۔ حدیث میں "قبر" کا لفظ مجازاً عالم برزخ کے لیے استعمال ہوا ہے، اور اس سے مراد وہ عالم ہے جس میں موت کی آخری جگہ سے لے کر بعثت بعد الموت کے پہلے جھٹکنے تک انسانی ارواح رہیں گی۔ منکرین حدیث کو اس پر اصرار ہے کہ یہ عالم بالکل عدم محض کا عالم ہے جس میں کوئی احساس اور شعور نہ ہوگا اور کسی قسم کا عذاب یا ثواب نہ ہوگا۔ لیکن یہاں دیکھیے کہ کفار کی رو میں جب قبض کی جاتی ہے تو وہ موت کی سرحد کے پار کا حال بالکل اپنی توقعات کے خلاف پا کر سراپیمہ ہو جاتی ہیں اور فوراً سلام ٹھونک کر ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم کوئی بڑا کام نہیں کر رہے تھے۔ جواب میں ملائکہ ان کو ڈانٹتے ہیں اور جہنم واصل ہونے کی پیشگی خبر دیتے ہیں۔ دوسری طرف انبیاء کی رو میں جب قبض کی جاتی ہے تو ملائکہ ان کو سلام بجالاتے ہیں اور جنتی ہونے کی پیشگی مبارکباد دیتے ہیں۔ کیا برزخ کی زندگی، احساس، شعور، عذاب اور ثواب کا اس سے بھی زیادہ کھلا ہوا کوئی ثبوت درکار ہے؟ اسی سے ملتا جلتا مضمون سورہ نساء آیت نمبر ۹۷ میں گزر چکا ہے جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں سے قبض روح کے بعد ملائکہ کی گفتگو کا ذکر آیا ہے۔ اور ان سب سے زیادہ صاف الفاظ میں عذاب برزخ کی تصریح سورہ مؤمن آیت ۴۵-۴۶ میں کی گئی ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرعون اور آل فرعون کے متعلق فرماتا ہے کہ "ایک سخت عذاب اُن کو گھیرے ہوئے ہے، یعنی صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، پھر جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو شدیدتر عذاب میں داخل کرو"۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث، دونوں سے موت اور قیامت کے درمیان کی حالت کا ایک ہی نقشہ معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ موت محض جسم و روح کی علیحدگی کا نام ہے نہ کہ بالکل معدوم ہو جانے کا۔ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد روح معدوم نہیں ہو جاتی بلکہ اُس پوری شخصیت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجربات اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔ اس حالت میں روح کے شعور، احساس، مشاہدات اور تجربات کی کیفیت خواب سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ ایک مجرم روح سے فرشتوں کی باز پرس اور پھر اُس کا عذاب اور اذیت میں مبتلا ہونا اور دوزخ کے سامنے

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۱﴾ جَنَّتْ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا يُجْرَى مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ

دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ”بہترین چیز اتنی شے ہے“ اس طرح کے نیکو کار لوگوں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا، دائمی قیام کی بنیتیں، جن میں وہ داخل ہوں گے، نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی،

پیش کیا جانا، سب کچھ اُس کیفیت سے مشابہ ہوتا ہے جو ایک نقل کے مجرم پر پھانسی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ایک ڈاؤن نے خواب کی شکل میں گرتی ہوگی۔ اسی طرح ایک پاکیزہ رُوح کا استقبال، اور پھر اُس کا جنت کی بشارت سنا، اور اُس کا جنت کی ہواؤں اور خوشبوؤں سے منتفع ہونا، یہ سب بھی اُس ملازم کے خواب سے ملتا جلتا ہوگا جو سُرین کار کردگی کے بعد سرکاری بلاو سے پریذکوارٹ میں حاضر ہوا اور عدہ ملاقات کی تاریخ سے ایک دن پہلے آئندہ انعامات کی امیدوں سے لبریز ایک سماں خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ خواب ایک لغت، نفع، صبر و دم سے ٹوٹ جائے گا اور ایک میدانِ حشر میں اپنے آپ کو جسم و روح کے ساتھ زندہ پا کر مجرمین حیرت سے کہیں گے کہ دُوبِلْنَا مَنْ بَعَثْنَا مِنْ قُرْقِدٍ نَا رَا رے یہ کون ہمیں ہماری خواب گاہ سے اُٹھالایا؟ مگر اہل ایمان پورے اطمینان سے کہیں گے کہ هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ (یہ وہی چیز ہے جس کا رحمن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کا بیان سچا تھا)۔ مجرمین کا فوری احساس اُس وقت یہ ہوگا کہ وہ اپنی خواب گاہ میں (جہاں بستر موت پر اُنہوں نے دنیا میں جان دی تھی) شاید کوئی ایک گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے اور اب اچانک اس حادثہ سے آنکھ کھلتے ہی کہیں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ مگر اہل ایمان پورے ثبات قلب کے ساتھ کہیں گے کہ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ وَلَئِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (اللہ کے دفتر میں تو تم روز حشر تک ٹھہرے رہے ہو اور یہی روز حشر ہے مگر تم اس چیز کو جانتے نہ تھے)۔

۳۱ یعنی کتے سے باہر کے لوگ جب خدا سے ڈرنے والے اور راستباز لوگوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ

کی لائی ہوئی تعلیم کے بارے میں سوال کرتے ہیں، تو ان کا جواب جھوٹے اور بددیانت کافروں کے جواب سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ جھوٹا پروپیگنڈا نہیں کرتے۔ وہ عوام کو بھگانے اور غلط فہمیوں میں ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ حضور کی اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم کی تصریحیں کرتے ہیں اور لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرتے ہیں۔

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ كَذَلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ﴿۳۱﴾ الَّذِينَ  
تَتَوَقَّعُهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ  
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ  
يَأْتِيَ أُمَّرٌ رَيْكٌ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ  
وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۳۳﴾ فَاصَابَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ

اور سب کچھ وہاں عین اُن کی خواہش کے مطابق ہوگا۔ یہ جزا دیتا ہے اللہ متقیوں کو۔ اُن متقیوں کو  
جن کی رُو میں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں ”سلام ہو تم پر جاؤ جنت  
میں اپنے اعمال کے بدلے۔“

اے محمد، اب جو یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں تو اس کے سوا اب اور کیا باقی رہ گیا ہے کہ ملائکہ  
ہی آپنچیں یا تیرے رب کا فیصلہ صادر ہو جائے؟ اس طرح کی ڈھٹائی ان سے پہلے بہت سے  
لوگ کر چکے ہیں۔ پھر جو کچھ اُن کے ساتھ ہوا وہ اُن پر اللہ کا ظلم نہ تھا بلکہ اُن کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے  
خود اپنے اوپر کیا۔ اُن کے کرتوتوں کی خرابیاں آخر کار اُن کی دامن گیر ہو گئیں اور وہی چیز اُن پر مسلط

۵۲۸ یہ ہے جنت کی اصل تعریف۔ وہاں انسان جو کچھ چاہے گا وہی اُسے ملے گا اور کوئی چیز اس کی مرضی اور پسند  
کے خلاف واقع نہ ہوگی۔ دنیا میں کسی رئیس کسی امیر کبیر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی یہ نعمت کبھی میسر نہیں آئی ہے، نہ  
یہاں اس کے حصول کا کوئی امکان ہے۔ مگر جنت کے ہر بلکین کو راحت و مسرت کا یہ درجہ کمال حاصل ہوگا کہ اُس کی زندگی میں  
بروقت ہر طرف سب کچھ اس کی خواہش اور پسند کے عین مطابق ہوگا۔ اُس کا ہر ارمان نکلے گا۔ اس کی ہر آرزو پوری ہوگی۔  
اس کی ہر چاہت عمل میں آکر رہے گی۔

۵۲۹ یہ چند کھلے بطور نصیحت اور تنبیہ کے فرمائے جا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک سمجھانے کا تعلق  
نہ تھا، تم نے ایک ایک حقیقت پوری طرح کھول کر سمجھا دی۔ دلائل سے اُس کا ثبوت دے دیا۔ کائنات کے پورے نظام سے  
اس کی شہادتیں پیش کر دیں۔ کسی ذمی غنم آدمی کے لیے شرک پر مجھے رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ اب یہ لوگ ایک صاف  
سیدھی بات کو مان لینے میں کیوں تامل کر رہے ہیں؟ کیا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ موت کا فرشتہ سانس سے آکھڑا ہو تو



بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ  
 مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا  
 مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى  
 الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿۳۸﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ

ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ع

یہ مشرکین کہتے ہیں ”اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اُس کے سوا کسی اور کی عبادت  
 کرتے اور نہ اُس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔“ ایسے ہی بہانے ان سے پہلے کے لوگ بھی  
 بناتے رہے ہیں۔ تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟  
 ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اُس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ

زندگی کے آخری لمحے میں مانیں گے، یا خدا کا عذاب سریر آ جائے تو اس کی پہلی چوٹ کھا لینے کے بعد ما نہیں گے؟

**۳۷** مشرکین کی اس محبت کو سورہ انعام آیات ۱۴۸-۱۴۹ میں بھی نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ مقام  
 اور اس کے حواشی اگر نگاہ میں رہیں تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔ (ملاحظہ ہو سورہ انعام حواشی نمبر ۱۲۱ تا ۱۲۶)۔  
**۳۸** یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج نہ لوگ اللہ کی مشیت کو اپنی گمراہی اور بد اعمالی کے لیے حجت بنا رہے  
 ہو۔ یہ تو بڑی پرانی دلیل ہے جسے ہمیشہ سے بڑے بڑے لوگ اپنے ضمیر کو دعوہ کا دینے اور ناصحوں کا منہ بند کرنے کے لیے  
 استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ مشرکین کی حجت کا پہلا جواب ہے۔ اس جواب کا پورا لطف اٹھانے کے لیے یہ بات ذہن میں رہنی  
 ضروری ہے کہ ابھی چند سطر پہلے مشرکین کے اُس پروپیگنڈا کا ذکر کر چکا ہے جو وہ قرآن کے خلاف یہ کہہ کہہ کر کیا کرتے تھے  
 کہ ”اجی، وہ تو پرانے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں، لگو یا اُن کو نبی پر اعتراض یہ تھا کہ یہ صاحب نئی بات کو نسی لائے  
 ہیں، وہی پرانی باتیں دہرا رہے ہیں جو طوفان نوح کے وقت سے لے کر آج تک ہزاروں مرتبہ کہی جا چکی ہیں۔ اس کے  
 جواب میں یہاں اُن کی دلیل رہے وہ بڑے زور کی دلیل سمجھتے ہوئے پیش کرتے تھے، کا ذکر کرنے کے بعد یہ لطیف  
 اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرات، آپ ہی کون سے ماڈرن ہیں، یہ مایہ ناز دلیل جو آپ لائے ہیں اس میں قطعاً کوئی اچھ موجود  
 نہیں ہے، وہی دُقیانوسی بات ہے جو ہزاروں برس سے گمراہ لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں، آپ نے بھی اُسی کو دہرا  
 دیا ہے۔“

اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُمْ مَن هَدَى اللَّهُ وَ  
 مِنْهُمْ مَن حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا  
 كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ ﴿۳۶﴾ إِنَّ تَخْرُصَ عَلَىٰ هُدَاهُمْ  
 فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿۳۷﴾

”اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور  
 کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔  
 اُسے محمدؐ تم چاہے ان کی ہدایت کے لیے کتنے ہی حریص ہو، مگر اللہ جس کو بھٹکا دیتا ہے پھر اسے ہدایت  
 نہیں دیا کرتا اور اس طرح کے لوگوں کی مدد کوئی نہیں کر سکتا۔“

۳۶ یعنی تم اپنے شرک اور اپنی خود مختارانہ تحلیل و تحریم کے حق میں ہماری مشیت کو کیسے سنبھال سکتے ہو  
 جبکہ ہم نے ہر امت میں اپنے رسول بھیجے اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا کام صرف ہماری بندگی  
 کرنا ہے، طاغوت کی بندگی کے لیے تم پیدا نہیں کیے گئے ہو۔ اس طرح جبکہ ہم پہلے ہی معقول ذرائع سے تم کو بتا چکے ہیں  
 کہ تمہاری ان گمراہیوں کو ہماری رضا حاصل نہیں ہے، تو اس کے بعد ہماری مشیت کی آڑ لے کر تمہارا اپنی گمراہیوں کو جانو  
 ٹھیرانا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ تم چاہتے تھے کہ ہم بھاننے والے رسول بھیجنے کے بجائے ایسے رسول بھیجتے ہو  
 ہاتھ پیر کر تم کو غلط راستوں سے کھینچ لیتے اور زبردستی تمہیں راست رو دیتے۔ (مشیت اور رخصت کے فرق کو سمجھنے کے  
 لیے ملاحظہ ہو سورۃ انعام حاشیہ نمبر ۸، سورۃ زمر حاشیہ ۱۲)

۳۷ یعنی ہر پیغمبر کی آمد کے بعد اُس کی قوم دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ بعض نے اس کی بات مان لی اور یہ مان لینا اللہ کی  
 توفیق سے تھا، اور بعض اپنی گمراہی پر جمے رہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ انعام حاشیہ نمبر ۸)

۳۷ یعنی تجربے سے بڑھ کر تحقیق کے لیے قابل اعتماد کوئی اور کوئی نہیں ہے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تاریخ انسانی  
 کے پے در پے تجربات کیا ثابت کر رہے ہیں۔ عذاب الہی فرعون و آل فرعون پر آیا یا موسیٰ اور بنی اسرائیل پر؟ صالح کے جھٹلانے  
 والوں پر آیا یا ماننے والوں پر؟ ہود اور نوح اور دوسرے انبیاء کے منکرین پر آیا یا مؤمنین پر؟ کیا واقعی ان تاریخی تجربات  
 سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جن لوگوں کو ہماری مشیت نے شرک اور مشرطیت سازی کے ارتکاب کا موقع دیا تھا ان کو  
 ہماری رضا حاصل تھی؟ اس کے برعکس یہ واقعات تو مریحاً ثابت کر رہے ہیں کہ نمائش اور نصیحت کے باوجود جو لوگ ان

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مِنْ مَوْتٍ بَلَىٰ وَعَدَا عَلَيْنَا  
حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخْتَلَفُونَ  
فِيهِ وَيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَذِبِينَ ﴿۳۹﴾ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ

یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا"۔ اٹھانے گا کیوں نہیں، یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور ایسا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں، اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے۔ (رہا اس کا امکان تو) ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے

گراہیوں پر اصرار کرتے ہیں انہیں ہماری مشیت ایک حد تک ارتکاب جرائم کا موقع دیتی چلی جاتی ہے اور پھر ان کا سنبھلنا خوب بھر جانے کے بعد ڈبو دیا جاتا ہے۔

**۳۵** یہ حیات بعد الموت اور قیام حشر کی عقلی اور اخلاقی ضرورت ہے۔ دنیا میں جب سے انسان پیدا ہوا ہے، حقیقت کے بارے میں بے شمار اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ انہی اختلافات کی بنا پر نسلوں اور قوموں اور خاندانوں میں پھوٹ پڑی ہے۔ انہی کی بنا پر مختلف نظریات رکھنے والوں نے اپنے الگ مذہب، الگ معاشرے، الگ تمدن بنا لئے یا اختیار کیے ہیں۔ ایک ایک نظریے کی حمایت اور وکالت میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے مختلف زمانوں میں جان، مال، آبرو، ہر چیز کی بازی لگادی ہے۔ اور بے شمار مواقع پر ان مختلف نظریات کے حامیوں میں ایسی سخت کشاکش ہوئی ہے کہ ایک نے دوسرے کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کی ہے، اور مٹنے والے نے مٹتے مٹتے بھی اپنا نقطہ نظر نہیں چھوڑا ہے۔ عقل چاہتی ہے کہ ایسے اہم اور سنجیدہ اختلافات کے متعلق کبھی تو صحیح اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ فی الواقع ان کے اندر حق کیا تھا اور باطل کیا، راستی پر کون تھا اور ناراستی پر کون۔ اس دنیا میں تو کوئی امکان اس پر دے کے اٹھنے کا نظر نہیں آتا۔ اس دنیا کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں حقیقت پر سے پردہ اٹھ نہیں سکتا۔ لہذا لامحالہ عقل کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ایک دوسرا ہی عالم درکار ہے۔

اور یہ صرف عقل کا تقاضا ہی نہیں ہے بلکہ اخلاق کا تقاضا بھی ہے۔ کیونکہ ان اختلافات اور ان کشمکشوں میں بہت سے فریقوں نے حصہ لیا ہے۔ کسی نے ظلم کیا ہے اور کسی نے سہا ہے۔ کسی نے قربانیاں کی ہیں اور کسی نے ان قربانیوں کو وصول کیا ہے۔ ہر ایک نے اپنے نظریے کے مطابق ایک اخلاقی فلسفہ اور ایک اخلاقی رویہ اختیار کیا ہے اور اس سے اپنی

إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۳۰﴾ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا  
فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنُؤَيِّتَهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۗ وَ  
لَآجِرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۳۱﴾ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَى  
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۳۲﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِيْ

وقف لازم

اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں "ہو جا" اور بس وہ ہوجاتی ہے۔  
جو لوگ ظلم سننے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے  
اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب کے  
بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)۔

اے محمدؐ، ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے

اور کھریوں انسانوں کی زندگیوں بڑے باجیلے طور پر متاثر ہوئی ہیں۔ آخر کوئی وقت تو ہونا چاہیے جبکہ ان سب کا اخلاقی نتیجہ  
جیلے یا سزا کی شکل میں ظاہر ہو۔ اس دنیا کا نظام اگر صحیح اور مکمل اخلاقی نتائج کے ظہور کا متحمل نہیں ہے تو ایک دوسری دنیا ہونی  
چاہیے جہاں یہ نتائج ظاہر ہو سکیں۔

۵۳۶ یعنی لوگ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اور تمام اگلے پچھلے انسانوں کو ایک وقت  
جلا اٹھانا کوئی بڑا ہی مشکل کام ہے۔ حالانکہ اللہ کی قدرت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے کسی ارادے کو پورا کرنے کے لیے کسی مرد  
سامان کسی سبب اور وسیلے، اور کسی سازگارٹی احوال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا ہر ارادہ محض اس کے حکم سے پورا ہوتا ہے۔  
اس کا حکم ہی مرد و سامان و جمود میں لاتا ہے۔ اس کے حکم ہی سے اسباب و وسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا حکم ہی اس کی مراد کے  
عین مطابق احوال تیار کر لیتا ہے۔ اس وقت جو دنیا موجود ہے یہ بھی مجرد حکم سے وجود میں آئی ہے، اور دوسری دنیا بھی آنا فانا  
صرف ایک حکم سے ظہور میں آسکتی ہے۔

۵۳۷ یہ اشارہ ہے ان مہاجرین کی طرف جو کفار کے ناقابل برداشت مظالم سے تنگ آ کر کٹے سے حبش کی طرف  
ہجرت کر گئے تھے۔ منکرین آخرت کی بات کا جواب دینے کے بعد یہ ایک مہاجرین حبشہ کا ذکر بھی پڑ دینے میں ایک لطیف نکتہ  
پر مشہور ہے۔ اس سے مقصود کفار مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ ظالموں ایہ جفا کاریاں کرنے کے بعد اب تم سمجھتے ہو کہ کبھی تم سے  
باز پرس اور مظلوموں کی داد رسی کا وقت ہی نہ آئے گا۔



إِلَيْهِمْ فَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾ بِالْبَيْتِ  
وَالزُّبُرِ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔ پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا، اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی تھی،

۳۸ بیان مشرکین مکہ کے ایک اعتراض کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اعتراض وہی ہے جو پہلے ہی تمام انبیاء پر ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین نے بھی آپ پر بار بار کیا تھا کہ تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو، پھر ہم کیسے مان لیں کہ خدا نے تم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

۳۹ یعنی علماء اہل کتاب، اور وہ دوسرے لوگ جو چاہے سکتے بند علماء نہ ہوں مگر بحال کتب آسمانی کی تعلیمات سے واقف اور انبیاء سابقین کی سرگزشت سے آگاہ ہوں۔

۴۰ تشریح و توضیح صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی، اور اپنی رہنمائی میں ایک پوری مسلم سوسائٹی کی تشکیل کر کے بھی اور ”ذکر الہی“ کے منشا کے مطابق اس کے نظام کو چلا کر بھی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہ حکمت بیان کر دی ہے جس کا تقاضا یہ تھا کہ لڑا ایک انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ ”ذکر“ فرشتوں کے ذریعہ سے بھی بھیجا جاسکتا تھا۔ براہ راست چھاپ کر ایک انسان تک بھی پہنچایا جاسکتا تھا۔ مگر محض ذکر ہیچ دینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت و ربوبیت اس کی تشریح کی متقاضی تھی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ اس ”ذکر کو ایک قابل ترین انسان لے کر آئے۔ وہ اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے اس کا مطلب سمجھائے جنہیں کچھ شک ہو ان کا شک رفع کرے جنہیں کوئی اعتراض ہو ان کے اعتراض کا جواب دے جو نہ مانیں اور مخالفت اور مزاحمت کریں ان کے متقابلہ میں وہ اس طرح کاروبار برت کر دکھائے جو اس ”ذکر کے حاملین کی شان کے شایاں ہے۔ جو مان لیں انہیں زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے، ان کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے، اور ان کو انفرادی و اجتماعی تربیت دے کر ساری دنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطور مثال رکھ دے جس کا پورا اجتماعی نظام ”ذکر کے منشا کی شرح ہو۔

یہ آیت جس طرح ان منکرین نبوت کی حجت کے لیے قاطع تھی جو خدا کا ”ذکر“ بشر کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے اسی طرح آج یہ ان منکرین حدیث کی حجت کے لیے بھی قاطع ہے جو نبی کی تشریح و توضیح کے بغیر صرف ”ذکر کو لے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اس بات کے قائل ہوں کہ نبی نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی تھی صرف ذکر پیش کر دیا تھا، یا اس کے قائل ہوں کہ مانتے

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳۴﴾ أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ  
أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ

اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں۔

پھر کیا وہ لوگ جو (دعوتِ پیغمبر کی مخالفت میں) بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں اس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے یا ایسے گرتے سے ان پر عذاب آئے

کے لائق صرف ذکر ہے نہ کہ نبی کی تشریح، یا اس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لیے صرف ذکر کافی ہے نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابل اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے، نبی کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو بھروسے کے لائق نہیں ہے، غرض ان چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں، ان کا مسلک بہر حال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔

اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی نے اُس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے یا براہ راست لوگوں تک پہنچا دینے کے بجائے اُسے واسطہٴ تبلیغ بنا یا گیا تھا۔

اور اگر وہ دوسری یا تیسری بات کے قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں نے (معاذ اللہ) یہ فضول حرکت کی کہ اپنا ذکر ایک نبی کے ذریعہ سے بھیجا۔ کیونکہ نبی کی آمد کا حاصل بھی وہی ہے جو نبی کے بغیر صرف ذکر کے مطبوعہ شکل میں نازل ہو جانے کا ہو سکتا تھا۔

اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوت محمدی، دونوں کے نسخ کا اعلان ہے جس کے بعد اگر کوئی مسلک منقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف اُن لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نبی نبوت اور نبی دجی کے قائل ہیں۔ اس لیے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید کے مقصد نزول کی تکمیل کے لیے نبی کی تشریح کو ناگزیر ٹھہرا رہا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرین حدیث کا یہ قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح و تشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھلے ہوئے ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ نمونہ اتباع کی حیثیت سے نبوت محمدی ختم ہو گئی اور ہمارا تعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اُس طرح کا رہ گیا جیسا ہنود اور صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں، ان پر ایمان لائے ہیں، مگر ان کا کوئی مسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز نبی نبوت کی ضرورت آپ سے آپ ثابت کر دیتی ہے، صرف ایک بے وقوف ہی اس کے بعد ختم نبوت پر اصرار کر سکتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ایسا قرآن نبی کی تشریح و تہیین کے بغیر خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لیے ناکافی ہے، اس لیے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ و جیج کر اسے بجائے خود کافی قرار دیں، مدعی سست کی حمایت میں

حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۷﴾ أَوْ يَأْخُذْهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۳۸﴾  
 أَوْ يَأْخُذْهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۳۹﴾ أَوْلَمْ يَرَوْا  
 إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَتَّحُوا ظِلَلَهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ  
 سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ ذَاخِرُونَ ﴿۴۰﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا  
 فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةِ وَهُمْ لَا يُسْتَكْبِرُونَ ﴿۴۱﴾

جدھر سے اس کے آنے کا ان کو وہم و گمان تک نہ ہو یا اچانک چلتے پھرتے ان کو پکڑنے یا ایسی  
 حالت میں انہیں پکڑے جبکہ انہیں خود آنے والی مصیبت کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور وہ اس سے  
 بچنے کی فکر میں چوکتے ہوں، وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے یہ لوگ اس کو عاجز کرنے کی طاقت نہیں  
 رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی نرم نوا اور رحیم ہے۔

اور کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے  
 حضور سجد کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے، سب کے سب اس طرح اظہارِ عجز کر رہے ہیں۔ زمین اور آسمانوں  
 میں جس قدر جاندار مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ ہیں سب اللہ کے آگے سرجود ہیں۔ وہ ہرگز کشتی نہیں کرتے،

لہذا ان چُست کی بات ہرگز نہیں چل سکتی اور ایک نئی کتاب کے نزدیک کی ضرورت آپ سے آپ خود قرآن کی رو سے ثابت ہو جاتی  
 ہے۔ فاطمہ اللہ اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعے سے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔

۴۱ یعنی تمام جسمانی اشیاء کے سائے اس بات کی علامت ہیں کہ پہاڑ ہوں یا درخت، جانور ہوں یا انسان،  
 سب کے سب ایک ہمہ گیر قانون کی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، سب کی پیشانی پر بندگی کا داغ لگا ہوا ہے، اُلویت میں کسی کا کوئی ادنیٰ  
 حصہ بھی نہیں ہے۔ سایہ پڑنا ایک چیز کے مادی ہونے کی کھلی علامت ہے، اور مادی ہونا بندہ و مخلوق ہونے کا کھلا ثبوت۔

۴۲ یعنی زمین ہی کی نہیں، آسمانوں کی بھی وہ تمام ہستیاں جن کو قدیم زمانے سے لے کر آج تک لوگ دیوی، دیوتا  
 اور خدا کے رشتہ دار ٹھہراتے آئے ہیں دراصل غلام اور تابعدار ہیں۔ ان میں سے کسی کا خداوندی میں کوئی حصہ نہیں۔  
 ضمناً اس آیت سے ایک اشارہ اس طرف بھی نکل آیا کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی میں نہیں ہیں بلکہ عالم بالا  
 کے ستیاردوں میں بھی ہیں۔ یہی بات سورہ شوریٰ آیت ۲۹ میں بھی ارشاد ہوئی ہے۔





يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِمَّنْ فَوْقَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿۵۱﴾ وَقَالَ  
 اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌُ وَاحِدٌ فَإِتَّيَا  
 فَارْهَبُونِ ﴿۵۲﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ  
 وَاصِبًا أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ﴿۵۳﴾ وَمَا يَكُفِّرُ بِنِعْمَةِ اللَّهِ  
 ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ﴿۵۴﴾ ثُمَّ إِذَا كُشِفَ  
 الضُّرُّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿۵۵﴾

اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ۵

اللہ کا فرمان ہے کہ ”دو خدا نہ بنا لو، خدا تو بس ایک ہی ہے، لہذا تم مجھی سے ڈرو۔ اسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور خالصاً اسی کا دین (ساری کائنات میں) چل رہا ہے۔ پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقویٰ کرو گے؟

تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔ مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے تو کیا تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو (اس مہربانی کے شکر یہ میں) شریک کرنے لگتا ہے۔

۵۴۳ دو خداؤں کی نفی میں دو سے زیادہ خداؤں کی نفی آپ سے آپ شامل ہے۔

۵۴۴ دوسرے الفاظ میں اسی کی اطاعت پر اس پورے کارخانہ ہستی کا نظام قائم ہے۔

۵۴۵ بالفاظ دیگر کیا اللہ کے بجائے کسی اور کا خوف اور کسی اور کی ناراضی سے بچنے کا جذبہ تمہارے نظام

زندگی کی بنیاد بنے گا؟

۵۴۶ یعنی یہ توحید کی ایک مزین شہادت تمہارے اپنے نفس میں موجود ہے۔ سخت مصیبت کے وقت جب

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَهُمْ فَمَتَّعُوهُمْ فَسَوَفَ تَعْلَمُونَ ۝۵۵ وَيَجْعَلُونَ  
 لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا سَرَاقَتِهِمْ تَاللَّهِ لَتَسْعُنَّ عَمَّا  
 كُنْتُمْ تَفْتَوُونَ ۝۵۶ وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُمْ مَا  
 يَشْتَهُونَ ۝۵۷ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ  
 مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝۵۸ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا

تاکہ اللہ کے احسان کی ناشکری کرے۔ اچھا، مزے کرو، مختصر یہیں معلوم ہو جائے گا۔  
 یہ لوگ جن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں ان کے حصے ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے  
 مقرر کرتے ہیں۔ خدا کی قسم ضرورت سے پوچھا جائے گا کہ یہ جھوٹ تم نے کیسے گھڑ لیے تھے؟  
 یہ خدا کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں سبحان اللہ! اور ان کے لیے وہ جو بہ خود چاہیں، جب  
 ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے  
 اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بڑی خبر کے بعد کیا

تمام من گھڑت تصورات کا رنگ ہٹ جاتا ہے تو عقوڑی دریک کے لیے تمہاری اصل نطرت ابھرتی ہے جو اللہ کے سوا کسی الٰہ کسی  
 رب اور کسی مالک ذی اختیار کو نہیں جانتی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ انعام حواشی نمبر ۲۹ و ۳۰ و ۳۱ حاشیہ ۳۱)  
 ۵۵ یعنی اللہ کے شکر یہ کے ساتھ ساتھ کسی بزرگ یا کسی دیوی دیوتا کے شکر یہ کی بھی نیازیں اور نذرینیں چڑھانی  
 شروع کر دیتا ہے اور اپنی بات بات سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اللہ کی اس مہربانی میں ان حضرت کی مہربانی کا بھی دخل  
 تھا، بلکہ اللہ بزرگ مہربانی نہ کرتا اگر وہ حضرت مہربان ہو کر اللہ کو مہربانی پر آمادہ نہ کرتے۔

۵۸ یعنی جن کے متعلق کسی مستند ذریعہ علم سے انہیں یہ تحقیق نہیں ہو ہے کہ اللہ میاں نے ان کو واقعی شکر یہ خدا ناسخ  
 کر رکھا ہے، اور اپنی عدالتی کے کاموں میں سے کچھ کام یا اپنی سلطنت کے علاقوں میں سے کچھ علاقے ان کو سونپ رکھے ہیں۔  
 ۵۹ یعنی ان کی نذر، نیاز اور بھینٹ کے لیے اپنی آمدنیوں اور اپنی اراضی کی پیداوار میں سے ایک مقرر حصہ لگ  
 نکال رکھتے ہیں۔

۵۷ مشرکین عرب کے معبودوں میں دیوتاؤں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ

بَشِيرًا بِهِ أَيَّمِسِكُهُ عَلَى هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ إِلَّا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوِّءِ وَ لِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَى وَ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٠﴾ وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَ لَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَ لَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٦١﴾ وَ يَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ

کسی کو منہ دکھائے سو چتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ — دیکھو کیسے بُرے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں۔ بُری صفات سے تشبہ کیے جانے کے لائق تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے۔ رہا اللہ تو اس کے لیے سب سے بڑی صفات ہیں، وہی تو سب پر غالب اور حکمت میں کامل ہے۔ ع۔

اگر ہمیں اللہ لوگوں کو ان کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا لیکن وہ سب کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے، پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ آج یہ لوگ وہ چیزیں اللہ کے لیے تجویز کر رہے ہیں جو خود اپنے لیے انہیں ناپسند ہیں،

یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کو بھی وہ خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔

۵۱ یعنی بیٹے۔

۵۲ یعنی اپنے لیے جس بیٹی کو یہ لوگ اس قدر موجب ننگ و عار سمجھتے ہیں، اسی کو خدا کے لیے بلا تامل تجویز کر دیتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ خدا کے لیے اولاد تجویز کرنا بھانسنے خود ایک شدید جہالت اور گستاخی ہے، مشرکین عرب کی اس حرکت پر یہاں اس خاص پہلو سے گرفت اس لیے کی گئی ہے کہ اللہ کے متعلق ان کے تصور کی پستی واضح کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ مشرکوں نے اللہ کے معاملے میں ان کو کس قدر جبری اور گستاخ بنا دیا ہے اور وہ کس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے کوئی قیامت تک محسوس نہیں کرتے۔

وَتَصِفُ أَلْسِنَتَهُمُ الْكَذِبَ إِنَّ لَهُمُ الْحُسْنَىٰ لَأَجْرَهُمَ إِنَّ لَهُمُ  
 النَّارَ وَأَنَّهُمْ مُّفْرَطُونَ ﴿۶۲﴾ تَا لَلّٰهُ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ  
 فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ  
 أَلِيمٌ ﴿۶۳﴾ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا  
 فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۶۴﴾ وَاللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ  
 مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً

اور جھوٹ کھتی ہیں ان کی زبانیں کہ ان کے لیے بھلا ہی بھلا ہے۔ ان کے لیے تو ایک ہی چیز ہے  
 اور وہ ہے دوزخ کی آگ۔ ضرور یہ سب پہلے اُس میں پہنچائے جائیں گے۔

خدا کی قسم اے محمد! تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں (اور پہلے بھی یہی  
 ہوتا رہا ہے کہ) شیطان نے اُن کے بُرے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے (اور رسولوں کی بات  
 انہوں نے مان کر نہ دی)۔ وہی شیطان آج ان لوگوں کا بھی سرپرست بنا ہوا ہے اور یہ دردناک  
 سزا کے مستحق بن رہے ہیں۔ ہم نے یہ کتاب تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت  
 ان پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر آتری ہے اُن لوگوں  
 کے لیے جو اسے مان لیں۔

(تم ہر برسات میں دیکھتے ہو کہ) اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور پچا پچا ایک مُردہ  
 پڑی ہوئی زمین میں اُس کی بدولت جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے

۵۲۳ دوسرے الفاظ میں، اس کتاب کے نزول سے ان لوگوں کو اس بات کا بہترین موقع ملا ہے کہ ادا نام  
 اور تقلیدی نیکیاں کی بنا پر جن بے شمار مختلف مسلکوں اور مذہبوں میں یہ بیٹ گئے ہیں اُن کے بجائے صداقت کی ایک ایسی  
 پائیدار بنیاد پالیں جس پر یہ سب متفق ہو سکیں۔ اب جو لوگ اتنے بے وقوف ہیں کہ اس نعمت کے آجانے پر بھی اپنی کھلی حالت



لَقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿١٥﴾ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسِقِيكُمْ مِمَّا  
فِي بُطُونِهِمْ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ ﴿١٦﴾  
وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا

سُنَّے والوں کے لیے۔ ع

اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ اُن کے پیٹ سے گوبر اور خُون کے  
درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔  
(اسی طرح) کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور

ہی کو تزیین دے رہے ہیں وہ تباہی اور ذلت کے سوا اور کوئی انجام دیکھنے والے نہیں ہیں۔ اب تو سیدھا راستہ دہی پائے گا اور  
دوبی برکتوں اور رحمتوں سے مالا مال ہو گا جو اس کتاب کو مان لے گا۔

۵۳ یعنی یہ منظر ہر سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے کہ زمین بالکل چٹیل میدان پڑی ہوئی ہے زندگی کے  
کوئی آثار موجود نہیں، نہ گھاس پھوس ہے، نہ بیل بوٹے، نہ پھول تپتی، اور نہ کسی قسم کے حشرات الارض۔ اتنے میں بارش کا  
موسم آ گیا اور ایک دو تھپتھپے پڑتے ہی اسی زمین سے زندگی کے چشے اُبلنے شروع ہو گئے۔ زمین کی تہوں میں دبی ہوئی جینما  
جڑیں یکایک جھی اٹھیں اور ہر ایک کے اندر سے وہی نباتات پھر برآمد ہو گئی جو پھلی برسات میں پیدا ہونے کے بعد رچی  
تھی۔ بے شمار حشرات الارض جن کا نام و نشان تک گری کے زمانے میں باقی نہ رہا تھا، یکایک پھر اُسی شان سے نمودار ہو گئے  
جیسے پھلی برسات میں دیکھے گئے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی زندگی میں بار بار تم دیکھتے رہتے ہو، اور پھر بھی تمہیں نبی کی زبان  
سے یہ سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اشد تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس حیرت کی وجہ اس کے سوا اور کیا  
ہے کہ تمہارا مشاہدہ بے عقل حیوانوں کا سا مشاہدہ ہے۔ تم کائنات کے کوشموں کو تو دیکھتے ہو، مگر اُن کے پیچھے خالق کی قدرت  
اور حکمت کے نشانات نہیں دیکھتے۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ نبی کا بیان سُن کر تمہارا دل نہ پکارا ٹھٹھا کہ فی الواقع یہ نشانیاں اُس کے  
بیان کی تائید کر رہی ہیں۔

۵۴ ”گوبر اور خُون کے درمیان“ کا مطلب یہ ہے کہ جانور جو غذا کھاتے ہیں اُس سے ایک طرف تو خُون بنتا ہے  
اور دوسری طرف فضلہ۔ مگر انہی جانوروں کی صنعت اُنات ہیں اُسی غذا سے ایک تیسری چیز بھی پیدا ہو جاتی ہے جو خاصیت، رنگ  
بو، فائدے اور مقصد میں ان دونوں سے بالکل مختلف ہے۔ پھر خاص طور پر مویشیوں میں اس چیز کی پیداوار انہی زیادہ ہوتی  
ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد انسان کے لیے بھی بہترین غذا کثیر مقدار میں فراہم کرتے رہتے ہیں۔

وَرِزْقًا حَسَنًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٦٤﴾ وَأَوْحِي  
رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ

بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں  
کے لیے۔

اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹیٹیوں

۵۵۵ اس میں ایک ضمنی اشارہ اس ضمن کی طرف بھی ہے، کہ پھلوں کے اس عرق میں وہ مادہ بھی موجود ہے جو  
انسان کے لیے حیات بخش غذائیں سکتا ہے، اور وہ مادہ بھی موجود ہے جو سڑ کر الکحول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سب یہ انسان  
کی اپنی قوت انتخاب پر منحصر ہے کہ وہ اس سرخیشے سے پاک رزق حاصل کرتا ہے یا عقل و غرور نائل کر دینے والی شراب۔ ایک اور  
ضمنی اشارہ شراب کی حرمت کی طرف بھی ہے کہ وہ پاک رزق نہیں ہے۔

۵۵۶ وحی کے لغوی معنی میں خفیہ اور لطیف اشارے کے جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی  
اور محسوس نہ کر کے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ انشاء (دل میں بات ڈال دینے) اور الہام (مخفی تعلیم و تلقین) کے معنی میں استعمال  
ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب و درس گاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں  
سے دی جاتی ہے کہ بظاہر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پاتا نظر نہیں آتا، اس لیے اس کو قرآن میں وحی، الہام اور انشاء کے الفاظ سے  
تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظ وحی، انبیاء کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔  
الہام کو اولیاء اور بندگان خاص کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اور انشاء نسبتاً عام ہے۔

لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا۔ بیان آسمانوں پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق ان کا سالانہ انعام چلتا  
ہے وَادْوَحِي فِي كُلِّ سَمَاءٍ آهْرَاطُ السَّجْدِ۔ زمین پر بھی وحی ہوتی ہے جس کا اشارہ پاتے ہی وہ اپنی سرگزشت سناتے  
لگتی ہے اَيُّومِيذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا يَا رَّبُّكَ أَوْحِي لَهُمَا (الزلزال)۔ ملائکہ پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق  
وہ کام کرتے ہیں رَاذِيُوْحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَتِي مَعَكُمْ (الانفال)۔ شہد کی مکھی کو اس کا پورا کام وحی فطری تعلیم کے  
ذریعہ سے سکھایا جاتا ہے جیسا کہ آیت زیر بحث میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی تک ہی محدود نہیں ہے  
مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دودھ پینا بھی وحی خداوندی ہی سکھایا کرتی ہے۔ پھر ایک انسان کو غور و فکر  
اور تحقیق و تجسس کے بغیر جو صحیح تدبیر یا صاحب رائے، یا فکر و عمل کی صحیح راہ سمجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے (وَ اٰوْحَيْنَا اِلٰى اٰدَمَ  
مُوْسٰى اَنْ اَسْرِضِعِيْهِ۔ القصص) اور اس وحی سے کوئی انسان بھی محروم نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے اکتشافات ہوئے ہیں،  
جتنی مفید ایجادیں ہوئی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاتحین، مفکرین اور مصلحین نے جو معرکے کے کام کیے ہیں، ان سب میں اس  
وحی کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آٹے دن اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی بیٹھے بیٹھے دل میں

وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ﴿٦٨﴾ ثُمَّ كَلَّيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ  
سَرَائِكَ ذُلًّا ۖ يُخْرِجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ  
فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٦٩﴾

پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہمواری کی ہوئی  
راہوں پر چلتی رہے۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ رنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں  
کے لیے یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

ایک بات آئی، یا کوئی تدبیر سوچ گئی، یا خواب میں کچھ دیکھ لیا، اور بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو غیب سے  
انہیں حاصل ہوئی تھی۔

ان بہت سی اقسام میں سے ایک خاص قسم کی وحی وہ ہے جس سے انبیاء علیہم السلام نوازے جاتے ہیں اور یہ وحی اپنی  
خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیے جانے والے کو پورا شعور ہوتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف  
سے آرہی ہے۔ اس کے من جانب اللہ ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ عقائد اور احکام اور قوانین اور ہدایات پر مشتمل ہوتی ہے۔  
اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعہ سے نوع انسانی کی رہنمائی کرے۔

۵۷ ”رب کی ہمواری کی ہوئی راہوں“ کا اشارہ اس پورے نظام اور طریقہ کار کی طرف ہے جس پر شہد کی کھیلوں کا ایک  
گروہ کام کرتا ہے۔ ان کے پھتوں کی ساخت، ان کے گروہ کی تنظیم، ان کے مختلف کارکنوں کی تقسیم کار، ان کی فراہمی غذا کے لیے  
ہیوم آمد و رفت، ان کا باقاعداگی کے ساتھ شہد بنا بنا کر ذخیرہ کرتے جانا، یہ سب وہ راہیں ہیں جو ان کے عمل کے لیے ان کے رہنے  
اس طرح ہموار کر دی ہیں کہ انہیں کبھی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس ایک مقرر نظام ہے جس پر ایک  
لگے بندھے طریقے پر شکر کے یہ بے شمار چھوٹے چھوٹے کارخانے ہزار ہا برس سے کام کیے چلے جا رہے ہیں۔

۵۸ شہد کا ایک مفید اور لذیذ غذا ہونا تو ظاہر ہے، اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ اس کے اندر شفا ہونا  
نسبتاً ایک مخفی بات ہے اس لیے اس پر متنبہ کر دیا گیا۔ شہد اول تو بعض امراض میں بجائے خود مفید ہے، کیونکہ اس کے اندر  
پھولوں اور پھلوں کا رس، اور ان کا گل کو زراہی ہتھوں میں موجود ہوتا ہے۔ پھر شہد کا یہ خاصہ کہ وہ خود بھی نہیں سڑتا اور  
دوسری چیزوں کو بھی اپنے اندر ایک مدت تک محفوظ رکھتا ہے، اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ دوائیں تیار کرنے میں اس سے مدد  
لی جائے چنانچہ لکھنؤ کے بجائے دنیا کے فن دو سازی میں وہ صدیوں اسی غرض کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے مزید برآں شہد کی  
کسی اگر کسی ایسے علاقے میں کام کرتی ہے جہاں کوئی خاص جڑی بوٹی کثرت سے پائی جاتی ہو تو اس علاقے کا شہد محض شہد ہی نہیں



وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّكُمْ ۖ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَسَدَلِّ

اور دیکھو اللہ نے تم کو پیدا کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے اور تم میں سے کوئی بدترین عمر کو

ہوتا بلکہ اس جڑی بوٹی کا بہترین جو ہر بھی ہوتا ہے اور اس مرض کے لیے مفید ہوتا ہے جس کی دوا اس جڑی بوٹی میں خدا نے پیدا کی ہے۔ شمد کی کمی سے یہ کام اگر باقاعدگی سے لیا جائے، اور مختلف نباتی دواؤں کے جوہر اس سے نکلوا کر ان کے شمد علیحدہ علیحدہ محفوظ کیے جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ یہ شمد لیبارٹریوں میں نکالے ہوئے جوہروں سے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

۵۵۹ اس پر سے بیان سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے دوسرے جز کی صداقت ثابت کرنا ہے۔

کفار و مشرکین دو ہی باتوں کی وجہ سے آپ کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ آپ آخرت کی زندگی کا تصور پیش کرتے ہیں جو اخلاق کے پورے نظام کا نقشہ بدل ڈالتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ صرف ایک اللہ کو معبود اور مطاع اور شکل کشاؤ پر اصرار قرار دیتے ہیں جس سے وہ پورا نظام زندگی غلط قرار پاتا ہے جو شرک یا دہریت کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہو۔ دعوت محمدی کے اسی دماغی اجزاء کو برحق ثابت کرنے کے لیے یہاں آثار کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بیان کا مدعا یہ ہے کہ اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، یہ آثار جو ہر طرف پائے جاتے ہیں ان کی تصدیق کر رہے ہیں یا تمہارے ادہام و خیالات کی؟ یہی کتاب ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ تم اسے ایک ان ہونی بات قرار دیتے ہو۔ مگر زمین ہر بارش کے موسم میں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ عادیہ خلق نہ صرف ممکن ہے بلکہ روز تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ یہی کتاب ہے کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے۔ تمہارے دہرے اس بات کو ایک بے ثبوت و دعویٰ قرار دیتے ہیں۔ مگر موشیوں کی ساخت، کھجوروں اور انگوروں کی بناوٹ اور شمد کی مکھیوں کی خلقت گواہی دے رہی ہے کہ ایک حکیم اور رب جیم نے ان چیزوں کو ڈیزائن کیا ہے، اور نہ کیونکر ممکن تھا کہ اتنے جانور اور اتنے درخت اور اتنی مکھیاں مل جل کر انسان کے جیسے ایسی ایسی نفیس اور لذیذ اور مفید چیزیں اس باقاعدگی کے ساتھ پیدا کرتی رہیں۔ یہی کتاب ہے کہ اللہ کے سوا کوئی تمہاری پرستش اور حمد و ثنا اور شکر و وفا کا مستحق نہیں ہے۔ تمہارے مشرکین اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اپنے بت سے محدودوں کی تندر دنیا زبھالانہ پر اصرار کرتے ہیں۔ مگر تم خود ہی بتاؤ کہ یہ دودھ اور یہ کھجوریں اور یہ انگور اور یہ شمد جو تمہاری بہترین غذا ہیں، خدا کے سوا اور کس کی بخشی ہوئی نعمتیں ہیں؟ کس دیوی یا دیوتا یا ولی نے تمہاری رزق رسانی کے لیے یہ انتظامات کیے ہیں؟

۵۶۰ یعنی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تمہاری پرورش اور رزق رسانی کا سارا انتظام اللہ کے ہاتھ

میں ہے بلکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ تمہاری زندگی اور موت، دونوں اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ کوئی دوسرا زندگی بخشنے کا اختیار رکھتا ہے نہ موت دینے کا۔

الْعُمَىٰ لَكُمْ لَا يَعْلَمُ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ﴿٤٠﴾  
 وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا  
 بِرِزْقِي يَرْزُقِيهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ قَوْمٌ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ  
 اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٤١﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَ

پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جانتے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی  
 کامل ہے اور قدرت میں بھی۔ ع

اور دیکھو اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے پھر جن لوگوں کو یہ  
 فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں تاکہ دونوں  
 اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں کو انکار ہے؟  
 اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے

اللہ یعنی یہ علم جس پر تم ناز کرتے ہو اور جس کی بدولت ہی زمین کی دوسری مخلوقات پر تم کو شرف حاصل ہے، یہ  
 بھی خدا کا بخشا ہوا ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے یہ عبرت ناک منظر دیکھتے رہتے ہو کہ جب کسی انسان کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ لمبی عمر  
 دے دیتا ہے تو وہی شخص جو کبھی جوانی میں دوسروں کو قتل سکھاتا تھا، کس طرح گوشت کا ایک ٹوٹہ اس پر کر رہ جاتا ہے جسے اپنے  
 تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا۔

۶۲ زمانہ حال میں اس آیت سے جو عجیب و غریب معنی نکالے گئے ہیں وہ اس امر کی بدترین مثال ہیں کہ قرآن  
 کی آیات کو ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ایک ایک آیت کے الگ معنی لینے سے کسی کیسی لاطائل تاویلوں کا دروازہ  
 کھل جاتا ہے۔ لوگوں نے اس آیت کو اسلام کے فلسفہ معیشت کی اصل اور قانون معیشت کی ایک اہم دفعہ ٹھہرایا ہے۔ ان کے  
 نزدیک آیت کا منشا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے رزق میں فضیلت عطا کی ہو انہیں اپنا رزق اپنے نوکروں اور غلاموں کی  
 طرف ضرور لوٹا دینا چاہیے، اگر نہ لوٹائیں گے تو اللہ کی نعمت کے منکر قرار پائیں گے۔ حالانکہ اس پورے سلسلہ کلام میں قانون  
 معیشت کے بیان کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ اوپر سے تمام تقریر شرک کے ابطال اور توحید کے ثبات میں ہوتی چلی آ رہی  
 ہے اور آگے بھی مسلسل یہی مضمون چل رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ میں یہ ایک قانون معیشت کی ایک دفعہ بیان کر دینے کا آخر

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ

ان بیویوں سے تمہیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں۔

کونسا ننگ ہے؟ آیت کو اس کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بالکل برعکس مضمون بیان ہو رہا ہے۔ بیان استدلال یہ کیا گیا ہے کہ تم خود اپنے مال میں اپنے غلاموں اور نوکروں کو جو برابر کا درجہ نہیں دیتے۔ حالانکہ یہ مال خدا کا دیا ہوا ہے۔ تو آخر کس طرح یہ بات تم صحیح سمجھتے ہو کہ جو احسانات اللہ نے تم پر کیے ہیں ان کے شکر یہ میں اللہ کے ساتھ اس کے بے اختیار غلاموں کو بھی شریک کر لو اور اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھو کہ اختیارات اور حقوق میں اللہ کے یہ غلام بھی اس کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں؟

ٹھیک ہی استدلال، اسی مضمون سے سورہ روم، آیت نمبر ۸ میں کیا گیا ہے۔ وہاں اس کے الفاظ یہ ہیں:

صَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ هَلْ لَكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شَاكِرٍ فِيْ مَا رَزَقْتُمْ أَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاءً تَخَادَعُونَ هُمْ كَخِيْفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ اللہ تمہارے سامنے ایک مثال خود تمہاری اپنی ذات سے پیش کرتا ہے۔ کیا تمہارے اس رزق میں جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے تمہارے غلام تمہارے شریک ہیں حتیٰ کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں؟ اور تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنے برابر والوں سے ڈرتے ہو؟ اس طرح اللہ کھول کھول کر نشانیاں پیش کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں ۝

دونوں آیتوں کا تقابل کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی مثال سے استدلال کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسری کی تفسیر کر رہی ہے۔

شاید لوگوں کو غلط فہمی آئیں غمۃ اللہ یجحدون کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ انہوں نے تمہیل کے بعد متصلاً یہ فقرہ دیکھ کر خیال کیا کہ ہونہ ہوا اس کا مطلب یہی ہو گا کہ اپنے زیر دستوں کی طرف رزق نہ پھیر دینا ہی اللہ کی نعمت کا انکار ہے۔ حالانکہ جو شخص قرآن میں کچھ بھی نظر رکھتا ہے وہ اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر یہ غیر اللہ کو ادا کرنا اس کتاب کی نگاہ میں اللہ کی نعمتوں کا انکار ہے۔ یہ مضمون اس کثرت سے قرآن میں دہرایا گیا ہے کہ تلاوت و تدبیر کی عادت رکھنے والوں کو تو اس میں اشتباہ پیش نہیں آسکتا، البتہ اندکسوں کی مدد سے اپنے مطلب کی آیات نکال کر مضامین تیار کرنے والے حضرات اس سے ناواقف ہو سکتے ہیں۔

نعمت الہی کے انکار کا یہ مفہوم سمجھ لینے کے بعد اس فقرے کا یہ مطلب صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ جب یہ لوگ مالک اور ملوک کا فرق خوب جانتے ہیں، اور خود اپنی زندگی میں ہر وقت اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں، تو کیا پھر ایک اللہ ہی کے معاملہ میں انہیں اس بات پر اصرار ہے کہ اُس کے بندوں کو اس کا شریک و سیم ظہیرا میں اور جو نعمتیں انہوں نے اُس سے پائی ہیں اُن کا شکر یہ اُس کے بندوں کو ادا کریں؟

أَيُّ الْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِعَمَتِ اللَّهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ﴿۶۳﴾ وَيَعْبُدُونَ  
مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو پوجتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انہیں کچھ بھی رزق دینا ہے نہ زمین سے

۶۳ باطل کو مانتے ہیں یعنی یہ بے بنیاد اور بے حقیقت عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کی قسمیں بنانا اور بگاڑنا، ان کی مٹوا کر لانا اور رومیوں، سنسنا، انہیں اولاد دینا، ان کو روزگار دلوانا، ان کے مفد سے چٹوانا، اور انہیں بیماریوں سے بچانا کچھ دیویوں اور دیوتاؤں اور جنوں اور اگلے پچھلے بزرگوں کے اختیار میں ہے۔

۶۴ اگرچہ مشرکین مکہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں، اور ان نعمتوں پر اللہ کا احسان مانتے تھے، لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر یہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان بہت سی نعمتوں کا شکر بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اس نعمت بخشی میں ذلیل اور حقہ دار ٹھہرا رکھا تھا۔ اسی چیز کو قرآن اللہ کے احسان کا انکار دیتا ہے۔ مگر ان میں یہ بات بطور ایک قاعدہ کلیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکر یہ غیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سفارش سے، یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے، یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔

یہ دونوں اصولی باتیں سراسر انصاف اور عقل عام کے مطابق ہیں۔ ہر شخص خود بادی تاثر ان کی معقولیت سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک حاجت مند آدمی پر رحم کھا کر اس کی مدد کرتے ہیں، اور وہ اسی وقت اٹھ کر آپ کے سامنے ایک دوسرے آدمی کا شکر یہ ادا کر دیتا ہے جس کا اس امداد میں کوئی دخل نہ تھا۔ آپ چاہے اپنی فراخ دلی کی بنا پر اس کی اس بیوقوفی کو نظر انداز کر دیں اور آئندہ بھی اپنی امداد کا سلسلہ جاری رکھیں، مگر اپنے دل میں یہ ضرور سمجھیں گے کہ یہ ایک نہایت بدتمیز اور احسان فراموش آدمی ہے۔ پھر اگر دریافت کرنے پر آپ کو معلوم ہو کہ اس شخص نے یہ حرکت اس خیال کی بنا پر کی تھی کہ آپ نے اس کی جو کچھ بھی مدد کی ہے وہ اپنی نیک دلی اور فیاضی کی وجہ سے نہیں کی بلکہ اس دوسرے شخص کی خاطر کی ہے، اور حالیکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو آپ لا محالہ اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ اس کی اس بیوقوفی تاویل کا صریح مطلب آپ کے نزدیک یہ ہو گا کہ وہ آپ سے سخت بدگمان ہے اور آپ کے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ آپ کوئی رحیم اور شفیق انسان نہیں ہیں، بلکہ محض ایک دوست نواز اور بار بار شاہ آدمی ہیں، چند گنے بندے سے دوستوں کے توکل سے کوئی آئے تو آپ اس کی مدد ان دوستوں کی خاطر کر دیتے ہیں، اور نہ آپ



شَيْئًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٤٣﴾ فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ ۗ إِنَّ اللَّهَ  
يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٤٤﴾ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا  
أَوْ يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ ۖ وَمَنْ سَرَّزْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ  
مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا ۗ هَلْ يَسْتَوُونَ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۗ بَلْ أَكْثَرُهُمْ

اور نہ یہ کام وہ کر ہی سکتے ہیں، پس اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔  
اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک تو ہے غلام جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کوئی اختیار نہیں  
رکھتا۔ دوسرا شخص ایسا ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا کیا ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور  
چھپے خوب خرچ کرتا ہے۔ بتاؤ، کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ — الحمد للہ، مگر اکثر لوگ اس سیدی

کے ہاتھ سے کسی کو کچھ فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔

**۶۵** اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، یعنی اللہ کو دنیوی بادشاہوں اور مملوکوں اور مالاجوں پر تیاں نہ کرو کہ جس طرح  
کوئی ان کے مصاحبوں اور مقرب بارگاہ ملازموں کے توسط سے بغیر ان تک اپنی عرض معروض نہیں پہنچا سکتا اسی طرح اللہ کے متعلق  
بھی تم یہ گمان کرنے لگو کہ وہ اپنے قصر شاہی میں ملائکہ اور اولیاء اور دوسرے مقربین کے درمیان گھرا بیٹھا ہے اور کسی کا کوئی کام ان  
واسطوں کے بغیر اس کے اہل سے نہیں ہو سکتا۔

**۶۶** یعنی اگر مثالوں ہی سے بات سمجھنی ہے تو اللہ صحیح مثالوں سے تم کو حقیقت سمجھاتا ہے تم جو مثالیں دے رہے ہو  
وہ غلط ہیں، اس لیے تم ان سے غلط نتیجے نکال بیٹھتے ہو۔

**۶۷** سوال اور الحمد للہ کے درمیان ایک طبیعت خلا ہے جسے بھرنے کے لیے خود لفظ الحمد للہ ہی میں بلیغ اشارہ  
موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی کی زبان سے یہ سوال سن کر مشرکین کے لیے اس کا یہ جواب دینا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ دونوں برابر  
ہیں۔ ماحالہ اس کے جواب میں کسی نے صاف صاف اقرار کیا ہو گا کہ واقعی دونوں برابر نہیں ہیں، اور کسی نے اس اندیشے سے  
خاموشی اختیار کر لی ہو گی کہ اقراری جواب دینے کی صورت میں اس کے منطقی نتیجے کا بھی اقرار کرنا ہو گا اور اس سے خود بخود ان کے  
شرک کا ابطال ہو جائے گا۔ لہذا نبی نے دونوں کا جواب پا کر فرمایا الحمد للہ۔ اقرار کرنے والوں کے اقرار پر بھی الحمد للہ اور  
خاموش رہ جانے والوں کی خاموشی پر بھی الحمد للہ یہ پہلی صورت میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کا شکر ہے، اتنی بات تو تمہاری  
سمجھ میں آئی، دوسری صورت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ خاموش ہو گئے؟ الحمد للہ۔ اپنی ساری جٹ دھرمیوں کے باوجود

لَا يَعْلَمُونَ ۝۴۵ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمٌ لَا  
يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَى مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُ لَا يَأْتِ  
بِخَبْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ  
مُسْتَقِيمٍ ۝۴۶ وَاللَّهُ غِيبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ

بات کو نہیں جانتے۔

اللہ ایک اور مثال دیتا ہے۔ دو آدمی ہیں۔ ایک گونگا بہرا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا، اپنے  
آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے، جلد بھر بھی وہ اسے بھیجے کوئی بھلا کام اُس سے بن نہ آئے۔ دوسرا شخص ایسا ہے  
کہ انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود راہِ راست پر قائم ہے۔ بتاؤ کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟  
اور زمین و آسمان کے پوشیدہ مخلوق کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ اور قیامت کے پر پانچونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا

دونوں کو برابر کہہ دینے کی ہمت تم بھی نہ کر سکتے !!

۵۶۸ یعنی باوجودیکہ انسانوں کے درمیان وہ صریح طور پر با اختیار اور بے اختیار کے فرق کو محسوس کرتے ہیں اور  
اس فرق کو ملحوظ رکھ کر ہی دونوں کے ساتھ الگ الگ طرز عمل اختیار کرتے ہیں، پھر بھی وہ ایسے جاہل و نادان بنے ہوئے ہیں کہ  
خالق اور مخلوق کا فرق ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ خالق کی ذات اور صفات اور حقوق اور اختیارات، سب میں وہ مخلوق کو اس کا شریک  
سمجھ رہے ہیں اور مخلوق کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جو صرف خالق کے ساتھ ہی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ عالم اسباب  
میں کوئی چیز مانگی ہو تو گھر کے مالک سے مانگیں گے نہ کہ گھر کے غلام سے۔ مگر مبداء فیض سے حاجات طلب کرنی ہوں تو کائنات  
کے مالک کو چھوڑ کر اس کے بندوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیں گے۔

۵۶۹ پہلی مثال میں اللہ اور بناوٹی معبودوں کے فرق کو صرف اختیار اور بے اختیاری کے اعتبار سے نمایاں کیا گیا  
تھا۔ اب اس دوسری مثال میں وہی فرق اور زیادہ کھول کر صفات کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور  
ان بناوٹی معبودوں کے درمیان فرق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک با اختیار مالک ہے اور دوسرا بے اختیار غلام۔ بلکہ  
مزید برآں یہ فرق بھی ہے کہ یہ غلام نہ تمہاری پکار سنتا ہے، نہ اس کا جواب دے سکتا ہے، نہ کوئی کام با اختیار خود کر سکتا ہے۔  
اس کی اپنی زندگی کا سارا انحصار اُس کے آقا کی ذات پر ہے۔ اور آقا اگر کوئی کام اس پر چھوڑ دے تو وہ کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔  
بخلاف اس کے آقا کا حال یہ ہے کہ صرف ناطق ہی نہیں ناطق حکیم ہے، دنیا کو عدل کا حکم دیتا ہے۔ اور صرف فاعل مختار

إِلَّا كَلِمَۃً الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۵۰﴾  
 وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَ  
 جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۱﴾

مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے، بلکہ اس سے بھی کچھ کم تحقیقت یہ ہے کہ اللہ  
 سب کچھ کر سکتا ہے۔

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اُس نے  
 تمہیں کان دیئے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے، اس لیے کہ تم شکر گزار بنو۔

یہ نہیں، فاعل برحق ہے، جو کچھ کرتا ہے راستی اور صحت کے ساتھ کرتا ہے۔ بناؤ یہ کونسی دانائی ہے کہ تم ایسے آقا اور ایسے  
 غلام کو کیساں سمجھ رہے ہو؟

۵۰ بعد کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل جواب ہے کفار مکہ کے اُس سوال کا جو وہ اکثر نبی صلی اللہ علیہ  
 وسلم سے کیا کرتے تھے کہ اگر واقعی وہ قیامت آنے والی ہے جس کی تم ہمیں خبر دیتے ہو تو آخر وہ کس تاریخ کو آئے گی۔ یہاں اُن  
 کے سوال کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

۵۱ یعنی قیامت رفتہ رفتہ کسی طویل مدت میں واقع نہ ہوگی، نہ اس کی آمد سے پہلے تم دُور سے اس کو آتے دیکھو گے  
 کہ سنبھل سکو اور کچھ اس کے لیے تیاری کر سکو۔ وہ تو کسی روز اچانک چشم زدوں میں، بلکہ اس سے بھی کم مدت میں آ جائے گی۔ لہذا  
 جس کو غور کرنا ہو سنجیدگی کے ساتھ غور کرے، اور اپنے رویہ کے متعلق بر فیصلہ بھی کرنا ہو جلدی کر لے، کسی کو اس بھروسے پر نہ رہنا  
 چاہیے کہ ابھی تو قیامت دور ہے، جب آنے لگے گی تو اللہ سے معاملہ درست کر لیں گے۔ تو حید کی تقریر کے درمیان  
 یہ ایک قیامت کا یہ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ لوگ تو حید اور شرک کے درمیان کسی ایک عقیدے کے انتخاب کے سوال کو محض  
 ایک نظری سوال نہ سمجھ بیٹھیں۔ انہیں یہ احساس رہنا چاہیے کہ ایک فیصلے کی گھڑی کسی نامعلوم وقت پر اچانک آ جانے  
 والی ہے اور اُس وقت اسی انتخاب کے صحیح یا غلط ہونے پر آدمی کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہوگا۔ اس تنبیہ کے بعد پھر وہی سلسلہ  
 تقریر شروع ہو جاتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا تھا۔

۵۲ یعنی وہ ذرائع جن سے تمہیں دنیا میں ہر طرح کی واقفیت حاصل ہوئی اور تم اس لائق ہوئے کہ دنیا کے کام چلا سکو  
 انسان کا بچہ پیدائش کے وقت جتنا بے بس اور بے خبر ہوتا ہے، اتنا کسی جانور کا نہیں ہوتا۔ مگر یہ صرت اللہ کے دیئے ہوئے ذرائع  
 علم و سماعت، بینائی، اور تغفل و تفکر، ہی ہیں جن کی بدولت وہ ترقی کر کے تمام موجوداتِ ارضی پر حکمرانی کرنے کے لائق بن جاتا ہے۔

۵۳ یعنی اُس خدا کے شکر گزار جس نے یہ بے بہا نعمتیں تم کو عطا کیں۔ ان نعمتوں کی اس سے بڑھ کر ناشکری اور کیا

الْمُيْرُوا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا  
 اللَّهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۶﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ  
 مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا  
 تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ وَمِنْ أَصْوَابِهَا وَأَوْبَارِهَا  
 وَأَشْعَارِهَا أَثَانًا وَمَتَاعًا إِلَى حِينٍ ﴿۵۷﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ  
 مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا وَجَعَلَ لَكُمْ

کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضا سے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں؟  
 اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے؟ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو  
 ایمان لاتے ہیں۔

اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا۔ اس نے جانوروں کی کھالوں سے  
 تمہارے لیے ایسے مکان پیدا کیے جنہیں تم سفر اور قیام دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو۔ اس نے جانوروں  
 کے صوف اور اون اور بالوں سے تمہارے لیے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دیں جو  
 زندگی کی مدت مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں۔ اس نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے  
 تمہارے لیے سائے کا انتظام کیا، پہاڑوں میں تمہارے لیے پناہ گاہیں بنائیں اور تمہیں ایسی

ہو سکتی ہے کہ ان کانوں سے آدمی سب کچھ سنے مگر ایک خدا ہی کی بات نہ سنے، ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھے مگر ایک  
 خدا ہی کی آیات نہ دیکھے اور اس دماغ سے سب کچھ سوچے مگر ایک ہی بات نہ سوچے کہ میرا وہ محسن کون ہے جس نے یہ  
 انعامات مجھے دیے ہیں۔

۵۶ یعنی چڑیوں کے نیچے جن کا رواج عرب میں بہت ہے۔

۵۷ یعنی آپ کو کچھ کرنا چاہتے ہو تو انہیں آسانی سے نکر کے اٹھالے جاتے ہو اور جب قیام کرنا چاہتے ہو تو



سَرَّابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَّابِيلَ تَقِيكُمُ بَأْسَكُمْ كَذَلِكَ يُتِمُّ  
نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ ﴿۸۱﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ  
الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمْ

پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ دوسری پوشاکیں جو آپس کی جنگ میں تمہاری حفاظت  
کرتی ہیں۔ اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے شاید کہ تم فرماں بردار نہ ہو۔ اب اگر یہ لوگ  
منہ موڑتے ہیں تو اے محمدؐ، تم پر صاف صاف پیغام حق پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری  
نہیں ہے۔ یہ اللہ کے احسان کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں بیش تر لوگ ایسے

آسانی سے اُن کو کھول کر ڈیرا جاملتے ہو۔

۸۱ سردی سے بچانے کا ذکر یا تو اس لیے نہیں فرمایا کہ گرمی میں کپڑوں کا استعمال انسانی تمدن کا تکمیلی درجہ ہے  
اور درجہ کمال کا ذکر دینے کے بعد تبدیلی درجات کے ذکر کی حاجت نہیں رہتی، یا پھر اسے خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے  
کہ جن ملکوں میں نہایت مہلک قسم کی باؤسوم چلتی ہے وہاں سردی کے لباس سے بھی بڑھ کر گرمی کا لباس اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے  
ممالک میں اگر آدمی سر، گردن، کان اور سارا جسم اچھی طرح ڈھانک کر نہ نکلے تو گرم ہوا سے ٹھنسل کر رکھ دے، بلکہ بعض اوقات  
تو آنکھوں کو چھوڑ کر پورا منہ تک لپیٹ لینا پڑتا ہے۔

۸۲ یعنی زرہ بکتر۔

۸۱ انتہام نعمت یا تکمیل نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر پہلو میں انسان کی ضروریات کا پوری  
جزیرے کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور پھر ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام فرماتا ہے۔ مثلاً اسی معاملے کو ایسے کہ خارجی  
اثرات سے انسان کے جسم کی حفاظت مطلوب تھی۔ اس کے لیے اللہ نے کس کس پہلو سے کتنا کتنا اور کیسا کچھ ہر دو سامان پیدا  
کیا، اس کی تفصیلات اگر کوئی لکھنے بیٹھے تو ایک پوری کتاب تیار ہو جائے۔ یہ گویا لباس اور مکان کے پہلو میں اللہ کی  
نعمت کا اتمام ہے۔ یا مثلاً تغذیہ کے معاملہ کو لیجیے۔ اس کے لیے کتنے بڑے پیمانے پر کیسے کیسے تنوعات کے ساتھ  
کیسی کیسی جڑی ضرورتوں تک کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ نے بے حد و حساب ذرائع فراہم کیے، اُن کا اگر کوئی جائزہ لینے بیٹھے تو  
شاید محض اقسام غذا اور اشیا، غذا کی فہرست ہی ایک ضخیم جلد بن جائے۔ یہ گویا تغذیہ کے پہلو میں اللہ کی نعمت کا اتمام ہے۔  
اسی طریقہ سے اگر انسانی زندگی کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہر گوشے میں اللہ نے ہم پر اپنی  
نعمتوں کا اتمام کر رکھا ہے۔



الْكَافِرُونَ ﴿۸۳﴾ وَ يَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ  
لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۸۴﴾ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا  
الْعَذَابَ فَلَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۸۵﴾ وَإِذَا سَأَ

ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ۷

(انہیں کچھ ہوش بھی ہے کہ اُس روز کیا بنے گی) جبکہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے پھر کافروں کو نہ تجتیس پیش کرنے کا موقع دیا جائیگا نہ ان سے توبہ و استغفار ہی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ ظالم لوگ جب ایک دفعہ عذاب دیکھ لیں گے تو اس کے بعد نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انہیں ایک لمحہ بھر کی مُہلت دی جائے گی۔ اور جب وہ لوگ جنہوں نے

۸۳ انکار سے مراد وہی طرز عمل ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کفار مکہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ یہ سارے احسانات اللہ نے اُن پر کیے ہیں، مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ نے یہ احسانات اُن کے بزرگوں اور دیوتاؤں کی مدد سے کیے ہیں، اور اسی بنا پر وہ ان احسانات کا شکر یہ اللہ کے ساتھ، بلکہ کچھ اللہ سے بھی بڑھ کر اُن متوسط ہستیوں کو ادا کرتے تھے۔ اسی حرکت کو اللہ تعالیٰ انکارِ نعمت اور احسانِ فراموشی اور کفران سے تعبیر کرتا ہے۔

۸۴ یعنی اُس اُمت کا نبی، یا کوئی ایسا شخص جس نے نبی کے گزر جانے کے بعد اس اُمت کو توحید اور خالص خدا پرستی کی دعوت دی ہو، شرک اور مشرکانہ ادبام و رسوم پر متنبہ کیا ہو، اور بعد قیامت کی جواب دہی سے خبردار کر دیا ہو۔ وہ اس امر کی شہادت دے گا کہ میں نے پیغام حق ان لوگوں کو پہنچا دیا تھا، اس لیے جو کچھ انہوں نے کیا وہ ناواقفیت کی بنا پر نہیں کیا بلکہ جانتے بوجھتے کیا۔

۸۵ یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں صفائی پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے جرائم ایسی صریح ناقابل انکار اور ناقابل تاویل شہادتوں سے ثابت کر دیے جائیں گے کہ ان کے لیے صفائی پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی

۸۶ یعنی اُس وقت اُن سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اب اپنے رب سے اپنے قصور کی معافی مانگ لو کیونکہ وہ فیصلے کا وقت ہو گا، معافی طلب کرنے کا وقت گزر چکا ہو گا۔ قرآن اور حدیث دونوں اس معاملہ میں ناطق ہیں کہ توبہ و استغفار کی جگہ دینا ہے نہ کہ آخرت۔ اور دنیا میں بھی اس کا موقع صرف اسی وقت تک ہے جب تک آثارِ موت طاری نہیں ہو جاتے جس وقت آدمی کو یقین ہو جائے کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے اُس وقت کی توبہ ناقابل قبول ہے صوت کی سرحد میں داخل

الَّذِينَ اشْرَكُوا شَرَكَاهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هُوَ كَمَا وَنَا  
الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ فَأَلْقُوا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ  
لَكَاذِبُونَ ﴿۸۶﴾ وَأَلْقُوا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَامَ وَضَلَّ عَنْهُمْ  
مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۸۷﴾ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ  
زَدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿۸۸﴾

دنیا میں شرک کیا تھا اپنے ٹھہراے ہوئے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے "اے پروردگار، یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے۔" اس پر ان کے وہ معبود انہیں صاف جواب دیں گے کہ "تم جھوٹے ہو۔" اُس وقت یہ سب اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری اقدار پر دازیاں رفق چکر ہو جائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے اُس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں برپا کرتے رہے۔

ہوتے ہی آدمی کی مصلحت عمل ختم ہو جاتی ہے اور صرف جزا و سزا ہی کا استخفاف باقی رہ جاتا ہے۔

۵۸۳ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بجائے خود اس واقعہ کا انکار کریں گے کہ مشرکین انہیں حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے پکارا کرتے تھے، بلکہ دراصل وہ اس واقعہ کے متعلق اپنے علم و اطلاع اور اس پر اپنی رضامندی و ذمہ داری کا انکار کریں گے وہ کہیں گے کہ ہم نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہمیں پکارا کرو، نہ ہم تمہاری اس حرکت پر راضی تھے، بلکہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہمیں پکار رہے ہو۔ تم نے اگر ہمیں صبح الدعاء اور عجیب الدعوات، اور دستگیر و فریادرس قرار دیا تھا تو یہ قطعی ایک جھوٹی بات تھی جو تم نے گھڑی تھی اور اس کے ذمہ دار تم خود تھے۔ اب ہمیں اس کی ذمہ داری میں پلینے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔

۵۸۴ یعنی وہ سب غلط ثابت ہوں گی۔ جی جن ساروں پر وہ دنیا میں بھروسا کیے ہوئے تھے وہ سارے کے سارے کم ہو جائیں گے۔ کسی فریادرس کو وہاں فریادری کے لیے موجود نہ پائیں گے۔ کوئی مشکل کشا ان کی مشکل حل کرنے کے لیے نہیں ملے گا۔ کوئی آگے بڑھ کر یہ کہنے والا نہ ہوگا کہ میرے متوسل تھے، انہیں کچھ نہ کہا جائے۔

۵۸۵ یعنی ایک عذاب خود کفر کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو راہ خدا سے روکنے کا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجُنَا  
بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَؤُلَاءِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ  
وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۸۹﴾ إِنَّ اللَّهَ بِأَمْرٍ بِالْعَدْلِ  
وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَائِي ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ

(اے محمد! انہیں اُس دن سے خبردار کر دو جب کہ ہم ہر امت میں خود اُسی کے اندر سے  
ایک گواہ اُٹھا کھڑا کریں گے جو اُس کے مقابلہ میں شہادت دے گا، اور ان لوگوں کے مقابلے میں  
شہادت دینے کے لیے ہم تمہیں لائیں گے۔ اور یہ اسی شہادت کی تیاری ہے کہ ہم نے یہ کتاب  
تم پر نازل کر دی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت  
اور بشارت ہے اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے تسلیمِ خم کر دیا ہے۔ ع

اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے

۵۸۶ یعنی ہر ایسی چیز کی وضاحت جس پر ہدایت و ضلالت اور فلاح و خسار کا مدار ہے جس کا جاننا راست روی  
کے لیے ضروری ہے جس سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ غلطی سے لوگ نڈیا نڈیا لگتی تھی اور اس کی ہم معنی  
آیات کا مطلب یہ لے لیتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ پھر وہ اسے بنا جاننے کے لیے قرآن سے سانس اور نونوں  
کے عجیب عجیب مضامین نکالنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

۵۸۷ یعنی جو لوگ آج اس کتاب کو مان لیں گے اور اطاعت کی راہ اختیار کر لیں گے ان کو یہ زندگی کے ہر معاملے میں صحیح  
رہنمائی دے گی اور اس کی پیروی کی وجہ سے اُن پر اللہ کی رحمتیں ہوں گی اور انہیں یہ کتاب خوشخبری دے گی کہ فیصلے کے دن اللہ کی  
عدالت سے وہ کامیاب ہو کر نکلیں گے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اسے مانیں گے وہ صرف ہی نہیں کہ ہدایت اور رحمت  
سے محروم رہیں گے، بلکہ قیامت کے روز جب خدا کا پیغمبران کے مقابلہ میں گواہی دینے کھڑا ہو گا تو یہی دستاویز اُن کے  
خلاف ایک زبردست حجت ہوگی۔ کیونکہ پیغمبر یہ ثابت کر دے گا کہ اس نے وہ چیز انہیں پہنچا دی تھی جس میں حق اور باطل کا فرق  
کھل کر دکھ دیا گیا تھا۔

۵۸۸ اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستگی کا



پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے۔ اور دوزبان میں اس مفہوم کو لفظ "انصاف" سے ادا کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو۔ اور پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں جو ہر امر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بیشک افراد معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوق شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل خلاف عدل ہے، مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی و اخلاقی مساوات، اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے۔ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن و تناسب ہے، اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی، اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔

دوسری چیز احسان ہے جس سے مراد سے نیک رتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، اور گور یا بھی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگوار یوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے، اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دیدے۔ ایسے ایک ٹھنڈے اور کھڑے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہوگی مگر محبت اور شکرگزاری اور عالی ظرفی اور اثار اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و عطاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشوونما دینے والی قدریں ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، صلہ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعت الہی ہر خاندان کے خوشحال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا نہ لگانے چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال

وَالْبَغْيُ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱۰﴾ وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ  
وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ

منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے  
اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں بچتے کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر

افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں سادہ ہر خاندان کے خوشحال افراد پر پیدائش ان کے اپنے غریب  
رشتہ داروں کا ہے، پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف  
ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین خاندان کے  
والدین، اس کے بیوی بچے، اور اس کے بھائی بہن میں پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں، اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں  
اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک قیمتی بچے کے چچا زاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں  
اور ایک دوسرے قیمتی بچے کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس  
پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحد (Unit) اس طرح اپنے اپنے  
افراد کو بحال لے اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوشحالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی عداوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی  
پاکیزگی و بندگی پیدا ہو جائے گی۔

۵۸۹ اور پر کی تین بھائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور  
اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز فحشاء ہے جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت  
قبیح ہو، فحش ہے۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی وغیرا، عمل قوم لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گایاں  
بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے، مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا، جہت  
تواشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن  
سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا، اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور نرقنا  
اور ناز واداکی نمائش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے  
ہیں اور تمام شرائع الہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بغی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا خواہ وہ حقوق

كَيْفَلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِي نَقَصَتْ  
غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ  
أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ۝

گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اُس عورت کی سی نہ ہو  
جائے جس نے آپ ہی محنت سے سُوت کا تانا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو  
آپس کے معاملات میں مکرو فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے  
حاصل کرے۔ حالانکہ اللہ اس عمد و پیمان کے ذریعے سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے،

خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

۹۰ بیان علی الترتیب تین قسم کے معاہدوں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے الگ الگ بیان کر کے ان کی پابندی  
کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک وہ عمد جو انسان نے خدا کے ساتھ باندھا ہو، اور دوسری اہمیت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ دوسرا وہ عمد  
جو ایک انسان یا گروہ نے دوسرے انسان یا گروہ سے باندھا ہو اور اس پر اللہ کی قسم کھائی ہو یا کسی نہ کسی طور پر اللہ کا نام لیکر  
اپنے قول کی پختگی کا یقین دلایا ہو۔ یہ دوسرے درجے کی اہمیت رکھتا ہے۔ تیسرا وہ عمد و پیمان جو اللہ کا نام لیے بغیر کیا گیا ہو  
اس کی اہمیت اور پیر کی دونوں قسموں کے بعد ہے۔ لیکن پابندی ان سب کی ضروری ہے اور خلاف ورزی ان میں سے کسی کی بھی  
روائیں ہیں۔

۹۱ بیان خصوصیت کے ساتھ عمد شکنی کی اُس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر جوہرِ فساد  
ہوتی ہے اور جسے بڑے بڑے اور بچے درجے کے لوگ بھی کار ثواب سمجھ کر کرتے اور اپنی قوم سے داد پاتے ہیں۔ قوموں اور گروہوں  
کی سیاسی، معاشی اور مذہبی کشمکش میں بیرائے دن ہونا رہتا ہے کہ ایک قوم کا ایڈرا ایک وقت میں دوسری قوم سے ایک معاہدہ  
کرتا ہے اور دوسرے وقت میں محض اپنے قومی مفاد کی خاطر باخدا سے علانیہ ٹوڑ دیتا ہے یا دوسرے اس کی خلاف ورزی کر کے  
ناجاہو فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ حرکتیں ایسے ایسے لوگ کر گزرتے ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں بڑے راست باز ہوتے ہیں۔ اور  
ان حرکتوں پر صحت یہی نہیں کہ ان کی پوری قوم میں سے ملامت کی کوئی آواز نہیں اٹھتی، بلکہ ہر طرف سے اُن کی پیٹھ ٹھونکی جاتی  
ہے اور اس طرح کی جال بازیوں کو بڑے بیسی کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر شدید فرماتا ہے کہ ہر معاہدہ دراصل معاہدہ کرنے  
والے شخص اور قوم کے اخلاق و دیانت کی آزمائش ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں ناکام ہوں گے وہ اللہ کی عدالت میں  
مٹا خذہ سے نہ بچ سکیں گے۔

وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۹۱﴾ وَلَوْ شَاءَ  
اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَ لَكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي

اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی  
ا کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں اتارے اور

۹۱ یعنی یہ فیصلہ تو قیامت ہی کے روز ہو گا کہ جن اختلافات کی بنا پر تمہارے درمیان کشمکش برپا ہے ان میں  
برسر حق کون ہے اور برسر باطل کون۔ لیکن بہر حال خواہ کوئی سراسر حق پر ہی کیوں نہ ہو، اور اس کا حریف بالکل گمراہ اور باطل پرست  
ہی کیوں نہ ہو، اس کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے گمراہ حریف کے مقابلہ میں عمد شکنی اور کذب و افترا اور  
مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرے ساگر وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے روز اللہ کے امتحان میں ناکام ثابت ہو گا، کیونکہ  
حق پرستی صرف نظریے اور مقصد ہی میں صداقت کا مطالبہ نہیں کرتی، طریق کار اور ذرائع میں بھی صداقت ہی چاہتی ہے۔ یہ  
بات خصوصیت کے ساتھ ان مذہبوں کو رہوں کی تنبیہ کے لیے فرمائی جا رہی ہے جو ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ  
ہم چونکہ خدا کے طرفدار ہیں اور ہمارا فریق مقابل خدا کا باغی ہے اس لیے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اسے جس طریقہ سے بھی ممکن ہو زک  
پہنچائیں۔ ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی صداقت، امانت اور  
وفائے عمد کا لحاظ رکھیں۔ ٹھیک یہی بات تھی جو عرب کے یہودیوں کو کرتے تھے کہ كَيْسٌ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيَّةِ سَبِيلٌ۔  
یعنی مشرکین عرب کے معاملہ میں ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے، ان سے ہر طرح کی خیانت کی جاسکتی ہے، جس چال اور  
تدبیر سے بھی خدا کے پیاروں کا بھلا ہو اور کافروں کو زک پہنچے وہ بالکل روا ہے، اس پر کوئی مٹاؤ اخذ  
نہ ہو گا۔

۹۲ یہ پچھلے مضمون کی مزید توضیح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کا طرفدار  
سمجھ کر بھلے اور رڑے ہر طریقہ سے اپنے مذہب کو جسے وہ خدائی مذہب سمجھ رہا ہے، فروغ دینے اور دوسرے  
مذہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کی یہ حرکت سراسر اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر  
اللہ کا منشا واقعی یہ ہوتا کہ انسان سے مذہبی اختلاف کا اختیار چھین لیا جائے اور چاروں چاروں سارے انسانوں کو  
ایک ہی مذہب کا پیرو بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لیے اللہ کو اپنے نام نہاد مدد طرفداروں کی اور ان کے  
ذیل ہتھیاروں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا۔ وہ سب کو  
مومن و فرماں بردار پیدا کر دیتا اور کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا۔ پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان و طاعت کی راہ سے  
بال برابر بھی جنبش کر سکتا؟



مَنْ يَشَاءُ وَكَتَسَلْنَ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾ وَلَا تَتَّخِذُوا  
 آيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا  
 السُّوءَ بِمَا صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۹۴﴾  
 وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ  
 لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ

جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے اور ضرورت سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی۔

(اور اے مسلمانو!) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بنا لینا،  
 کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو  
 اللہ کی راہ سے روکا، برا نتیجہ دیکھو اور سخت سزا بھگتو۔ اللہ کے عہد کو تھوڑے سے فائدے  
 کے بدلے بیچ ڈالو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو جو کچھ تمہارے  
 پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے،

۹۳ یعنی انسان کو اختیار و انتخاب کی آزادی اللہ نے خود ہی دی ہے، اس لیے انسانوں کی راہیں دنیا میں مختلف  
 ہیں، کوئی گمراہی کی طرف جانا چاہتا ہے اور اللہ اس کے لیے گمراہی کے اسباب ہموار کر دیتا ہے، اور کوئی راہِ راست کا  
 طالب ہوتا ہے اور اللہ اس کی ہدایت کا انتظام فرما دیتا ہے۔

۹۴ یعنی کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے بعد محض تمہاری بد اخلاقی دیکھ کر اس دین سے گشتہ  
 ہو جائے اور اس وجہ سے وہ اہل ایمان کے گروہ میں شامل ہونے سے رُک جائے کہ اس گروہ کے سب لوگوں سے اس کو سابقہ پیش  
 آیا ہوا ان کو اخلاق اور معاملات میں اُس نے کفار سے کچھ بھی مختلف نہ پایا ہو۔

۹۵ یعنی اُس عہد کو جو تم نے اللہ کے نام پر کیا ہو، یا دین الہی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کیا ہو۔

۹۶ یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے بڑے فائدے کے بدلے بیچ سکتے ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا جو  
 فائدہ بھی ہے وہ اللہ کے عہد کی قیمت میں تھوڑا ہے۔ اس لیے اس پیش بہا چیز کو اس چھوٹی چیز کے عوض بیچنا بہر حال  
 خسارے کا سودا ہے۔

وَلَنَجْزِيَنَ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۷﴾  
 مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً  
 طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۸﴾

اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے جو شخص  
 بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر  
 کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

۹۷» صبر سے کام لینے والوں کو، یعنی ان لوگوں کو جو ہر طرح اور خواہش اور جذبہ نفسانی کے مقابلہ میں  
 حق اور راستی پر قائم رہیں، ہر اس نقصان کو برداشت کر لیں جو اس دنیا میں راستبازی اختیار کرنے سے پہنچتا ہو  
 ہر اس فائدے کو شکر ادین جو دنیا میں ناجائز طریقہ اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتا ہو، اور حسن عمل کے مفید  
 نتائج کے لیے اس وقت تک انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں جو موجودہ دنیوی زندگی ختم ہو جانے کے بعد دوسری دنیا میں  
 آنے والا ہے۔

۹۸» اس آیت میں مسلم اور کافر دونوں ہی گروہوں کے ان تمام کم نظر اور بے صبر لوگوں کی غلط فہمی دور کی  
 گئی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی اور دیانت اور پرہیزگاری کی روشنی اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت چاہے ہی جاتی  
 ہو مگر اس کی دنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ اس صحیح رویے سے محض  
 آخرت ہی نہیں بنتی، دنیا بھی بنتی ہے۔ جو لوگ حقیقت میں ایماندار اور پاکباز اور معاملہ کے کھرے ہوتے ہیں ان کی دنیوی  
 زندگی بھی بے ایمان اور بد عمل لوگوں کے مقابلہ میں صریحاً بہتر رہتی ہے۔ جو ساکھ اور سچی عورت اپنی بے داغ سیرت کی وجہ  
 سے انہیں نصیب ہوتی ہے وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ جو ستھری اور پاکیزہ کامیسا بیاں انہیں حاصل ہوتی ہیں وہ  
 ان لوگوں کو میسر نہیں آتیں جن کی ہر کامیابی گندے اور گھاڑنے طریقوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ بوریانہ نہیں ہو کر بھی قلب  
 کے جن اطمینان اور ضمیر کی حس ٹھنڈک سے بہرہ مند ہوتے ہیں اس کا کوئی ادنیٰ سا حصہ بھی محلوں میں رہنے والے فساق و فجار  
 نہیں پاسکتے۔

۹۹» یعنی آخرت میں ان کا مرتبہ ان کے بہتر سے بہتر اعمال کے لحاظ سے مقرر ہوگا۔ بالفاظ دیگر جو شخص نے  
 دنیا میں چھوٹی اور بڑی، ہر طرح کی نیکیوں کی ہوں گی اُسے وہ اونچا مرتبہ دیا جائے گا جس کا وہ اپنی بڑی سے بڑی  
 نیکی کے لحاظ سے مستحق ہوگا۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿۹۸﴾  
 إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۹۹﴾  
 إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ  
 مُشْرِكُونَ ﴿۱۰۰﴾ وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا

پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔ اُسے ان لوگوں پر  
 تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا زور تو انہی لوگوں پر  
 چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شکر کرتے ہیں۔ ع  
 جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں — اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا

لئے اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ میں زبان سے اَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ کہہ دیا جائے  
 بلکہ اس کے ساتھ فی الواقع دل میں یہ خواہش اور عمل آئیے کو شمش بھی ہونی چاہیے کہ آدمی قرآن پڑھتے وقت شیطان کے گمراہ کن  
 دوسو سوں سے محفوظ رہے، غلط اور بے جا شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہو، قرآن کی ہر بات کو اس کی صحیح روشنی میں دیکھے، اور  
 اپنے خود ساختہ نظریات یا باہر سے حاصل کیے ہوئے تخیلات کی آمیزش سے قرآن کے الفاظ کو وہ معنی نہ پہنچانے لگے جو اللہ تعالیٰ  
 کے منشا کے خلاف ہوں۔ اس کے ساتھ آدمی کے دل میں یہ احساس بھی موجود ہونا چاہیے کہ شیطان سب سے بڑھ کر جس چیز کے درپے ہے  
 وہ یہی ہے کہ ابن آدم قرآن سے ہدایت نہ حاصل کرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے تو  
 شیطان اُسے بہکانے اور اغوا ہدایت سے روکنے اور نکر و فہم کی غلط راہوں پر ڈالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ اس لیے  
 آدمی کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت انتہائی جو کتا رہنا چاہیے اور ہر وقت خدا سے مدد مانگتے رہنا چاہیے کہ میں شیطان کی دراندازیوں  
 اُسے اس سرشت پر ہدایت کے نفع سے محروم نہ کر دیں۔ کیونکہ جس نے یہاں سے ہدایت نہ پائی وہ پھر کہیں ہدایت نہ پاسکے گا، اور جو اس  
 کتاب سے گمراہی اخذ کر بیٹھا اسے پھر دنیا کی کوئی چیز گمراہیوں کے چکر سے نہ نکال سکے گی۔

اس سلسلہ کلام میں یہ آیت جس غرض کے لیے آئی ہے وہ یہ ہے کہ آگے چل کر ان اعتراضات کا جواب دیا جا رہا ہے جو مشرکین  
 کو قرآن مجید پر کیا کرتے تھے اس لیے پہلے تمہید کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ قرآن کو اس کی اصلی روشنی میں صرف وہی شخص دیکھ سکتا ہے  
 جو شیطان کی گمراہ کن دوسو سوا نڈالیوں سے جو کتا ہو اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ سے پناہ مانگے۔ ورنہ شیطان کبھی  
 آدمی کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ سیدھی طرح قرآن کو اور اس کی باتوں کو سمجھ سکے۔

يُنزِلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفَرِّطٌ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۱﴾  
 قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ سَرِّبِكَ بِالْحَقِّ لِيُنَبِّتَ الَّذِينَ

نازل کرے — تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے کہو کہ اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو ٹھختہ

۱۱۔ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے سے مراد ایک حکم کے بعد دوسرا حکم بھیجا جاسکتا ہے کیونکہ قرآن مجید کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں اور بار بار ایک ہی معاملہ میں چند سال کے وقفوں سے یکے بعد دیگرے دو دو تین تین حکم بھیجے گئے ہیں۔ مثلاً شراب کا معاملہ، یا زنا کی سزا کا معاملہ۔ لیکن ہم کو یہ معنی لینے میں اس بنا پر تامل ہے کہ سورہ نحل کی یہ آیت کئی دور میں نازل ہوئی ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس دور میں بتدریج فی الاحکام کی کوئی مثال پیش نہیں آئی تھی۔ اس لیے ہم یہاں "ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لیے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصہ بار بار آیا ہے اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملہ کا کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک بات ایک وقت میں مجمل طور پر کہی گئی ہے اور دوسرے وقت میں مفصل۔ یہی چیز تھی جسے کفار مکہ اس بات کی دلیل ٹھیراتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، محاذ الشہداء قرآن خود تصنیف کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر اس کلام کا منبع علم الہی ہو تا تو پوری بات بیک وقت کہہ دی جاتی۔ اللہ کوئی انسان کی طرح ناقص العلم تصور نہیں ہے کہ سوچ سوچ کر بات کرے، رفتہ رفتہ معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک بات ٹھیک ٹھیک نظر نہ آئے تو دوسرے طریقہ سے بات کرے یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں جو تمہارے اس کلام میں نظر آ رہی ہیں۔

۱۲۔ "روح القدس" کا لفظی ترجمہ ہے "پاک روح" یا "پاکیزگی کی روح" اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریل کو دیا گیا ہے۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے مقصود سامعین کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کلام کو ایک ایسی روح نے کہا ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائن ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے کچھ اور بنا دے۔ نہ کذاب و مفتری ہے کہ خود کوئی بات گھڑ کے اللہ کے نام سے بیان کر دے۔ نہ بدشیت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس و مطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لاکر پہنچاتی ہے۔



أَمِنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۱۶﴾ وَ لَقَدْ نَعَّمْنَا لَهُمْ  
 يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ  
 أَعْجَبِي وَ هَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۷﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ

کرتے اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں منہلح و  
 سعادت کی خوشخبری دے۔

ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے۔ حالانکہ ان کا  
 اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عربی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی

۱۶ یعنی اس کے بتدریج اس کلام کو لے کر آنے اور بیک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ  
 کے علم و دانش میں کوئی نقص ہے، جیسا کہ تم نے اپنی نادانی سے سمجھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوت فہم اور قوت  
 اخذ میں نقص ہے جس کے سبب سے وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک وقت کی کبھی جوئی بات میں پختہ  
 ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ روح القدس اس کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے لائے، کبھی  
 اجمال سے کام لے اور کبھی اسی بات کی تفصیل بتائے، کبھی ایک طریقہ سے بات بھجائے اور کبھی دوسرے طریقے سے  
 کبھی ایک پیرایہ بیان اختیار کرے اور کبھی دوسرا، اور ایک ہی بات کو بار بار طریقے طریقے سے ذہن نشین کرنے کی  
 کوشش کرے، تاکہ مختلف قابلیتوں اور استعدادوں کے طالبین حق ایمان لاسکیں اور ایمان لانے کے بعد علم و یقین اور  
 فہم و ادراک میں پختہ ہو سکیں۔

۱۷ یہ اس تدریج کی دوسری مصلحت ہے۔ یعنی یہ کہ جو لوگ ایمان لاکر فرمانبرداری کی راہ چل رہے ہیں ان کو دعوت  
 اسلامی کے کام میں اور زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں جس موقع پر جس قسم کی ہدایات درکار ہوں وہ بروقت دے دی جائیں۔  
 ہے کہ نہ انہیں قبل از وقت بھیجنا مناسب ہو سکتا ہے، اور نہ بیک وقت ساری ہدایات دے دینا مفید ہے۔

۱۸ یہ اس کی تیسری مصلحت ہے۔ یعنی یہ کہ فرماں برداروں کو جن مزاہمتوں اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے  
 اور جس طرح انہیں ستایا اور تنگ کیا جا رہا ہے، اور دعوت اسلامی کے کام میں مشکلات کے جو پہاڑ سوارہ ہو رہے ہیں، ان  
 کی وجہ سے وہ بار بار اس کے علاج ہوتے ہیں کہ بشارتوں سے ان کی بہت بندھائی جاتی رہے اور ان کو آخری نتائج کا مہمانی  
 کا یقین دلایا جاتا رہے تاکہ وہ پُر امید رہیں اور دل شکستہ نہ ہونے پائیں۔

۱۹ روایات میں مختلف اشخاص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کفار مکہ ان میں سے کسی پر یہ گمان کرتے تھے۔

بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۴﴾ إِنَّمَا  
يَقْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ  
الْكٰذِبُونَ ﴿۱۵﴾ مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ  
أُكْرِهَ وَ قَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلٰكِنْ مَنْ شَرَحَ  
بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ

آیات کو نہیں مانتے اللہ کبھی ان کو صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور ایسے لوگوں کے لیے  
دردناک عذاب ہے۔ (جھوٹی باتیں نبی نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی  
آیات کو نہیں مانتے، وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔

جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان مطمئن ہو جاتا ہے  
خیر، مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے

ایک روایت میں اس کا نام جبر بیان کیا گیا ہے جو عامر بن المحضر کا ایک رومی غلام تھا۔ دوسری روایت میں جو طیب بن  
عبد العزیز کے ایک غلام کا نام لیا گیا ہے جسے عائشہ یا عیش کتے تھے۔ ایک اور روایت میں یسار کا نام لیا گیا ہے جس  
کی کنیت ابو کبیرہ تھی اور جو کتے کی ایک عورت کا بیٹا تھا۔ ایک اور روایت بلعان یا بلعام نامی ایک رومی غلام  
سے متعلق ہے۔ بہر حال ان میں سے جو بھی ہو، کفار مکہ نے محض یہ دیکھا کہ ایک شخص توراہ و انجیل پڑھتا ہے اور محمد صلی اللہ  
علیہ وسلم کی اس سے ملاقات ہے، بے تکلف یہ الزام گھڑ دیا کہ اس قرآن کو دراصل وہ تصنیف کر رہا ہے اور محمد صلی اللہ  
علیہ وسلم اسے اپنی طرف سے خدا کا نام لے لے کر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت  
کے مخالفین آپ کے خلاف افتراء و ازرباں کرنے میں کس قدر بے باک تھے، بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں  
کی قدر و قیمت پہچانتے میں کتنے بے انصاف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے تاریخ انسانی کی ایک عظیم شخصیت  
تھی جس کی نظیر نہ اس وقت دنیا بھر میں کہیں موجود تھی اور نہ آج تک پائی گئی ہے۔ مگر ان عقل کے اندھوں کو اس کے مقابلہ میں ایک  
عجی غلام، جو کچھ توراہ و انجیل پڑھ لیتا تھا، قابلِ نظر آ رہا تھا اور وہ گمان کر رہے تھے کہ یہ گو بہر نایاب اس کو نکلے سے چمک  
حاصل کر رہا ہے۔

عَظِيمٌ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ يَأْتِيهِمْ اَسْتَعْبُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْاٰخِرَةِ  
وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ

بڑا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا، اور اللہ کا  
قاعدہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو راہِ نجات نہیں دکھاتا جو اُس کی نعمت کا کفران کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے

۱۷ دو ستر ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جمہورِ نوروہ لوگ گھڑا کرتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان

نہیں لاتے ۱۷

۱۸ اس آیت میں ان مسلمانوں کے معاملے سے بحث کی گئی ہے جن پر اُس وقت سخت مظالم توڑے جا رہے  
تھے اور ناقابلِ برداشت اذیتیں دے دے کر کفر پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ان کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم کسی وقت ظلم سے مجبور ہو کر  
محض جان بچانے کے لیے کلمہ کفر زبان سے ادا کرو، اور دل تمہارا عقیدہ کفر سے محفوظ ہو، تو معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن  
اگر دل سے تم نے کفر قبول کر لیا تو دنیا میں چاہے جان بچا لو، خدا کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ یہ صرف رخصت ہے۔ اگر ایمان  
دل میں رکھتے ہوئے آدمی مجبوراً ایسا کہہ دے تو مواخذہ نہ ہوگا۔ ورنہ مقامِ عزیمت ہی ہے کہ عواہ آدمی کا جسم نکالوٹی کر ڈالا جائے  
بہر حال وہ کلمہ حق ہی کا اعلان کرتا رہے۔ دونوں قسم کی نظریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف  
جناب بن اُرت ہیں جن کو آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا بیان تک کہ ان کی چربی کھلنے سے آگ بجھ گئی، مگر وہ سختی کے ساتھ  
اپنے ایمان پر جمے رہے۔ بلال حبشی ہیں جن کو لوہے کی زہرہ پنا کر چھلپاتی ڈھوپ میں کھرا کر دیا گیا، پھر تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر  
گھسیٹا گیا مگر وہ اصرار ہی کرتے رہے۔ حبیب بن زید بن عاصم ہیں جن کے بدن کا ایک ایک عضو سیلہ کذاب کے حکم سے کاٹا  
جاتا تھا اور پھر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ سیلہ کو نبی مان لیں، مگر ہر مرتبہ وہ اس کے دعوائے رسالت کی شہادت دینے سے انکار  
کرتے تھے یہاں تک کہ اسی حالت میں کٹ کٹ کر انہوں نے جان دے دی۔ دوسری طرف ثمار بن یاسر ہیں جن کی آنکھوں  
کے سامنے ان کے والد اور ان کی والدہ کو سخت عذاب دے دے کر شہید کر دیا گیا، پھر ان کو اتنی ناقابلِ برداشت اذیت  
دی گئی کہ آخر کار انہوں نے جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کفار اُن سے کہنا چاہتے تھے۔ پھر وہ روتے ہوئے  
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ مَا تَرَكْتُ حَقِّي سَبَبْتُكَ ذَكَرْتُ الْفَقْرَ  
يَحْتَجِرُ "یا رسول اللہ، مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک کہ میں نے آپ کو بُرا اور ان کے مجبوروں کو اچھا نہ کہہ دیا، حضور نے  
پوچھا كَيْفَ يَتَّخِذُ قَلْبُكَ اِظْنَهُ دَلَّ كَيْفَ حَالٍ يَأْتِيهِمْ؟ عرض کیا مَطْمَئِنَّا بِالْاِيْمَانِ "ایمان پر پوری طرح مطمئن  
اس پر حضور نے فرمایا ان عَادُوا فَعُدُّوا "اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو تم پھر بھی باتیں کہہ دینا ۱۸

اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَ سَمِعِهِمْ وَ أَبْصَارِهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿۱۰﴾  
 لَاجِرَةً أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۱۱﴾ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ  
 لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا قُتِلُوا تَزَجَّهُدُوا وَ صَبَرُوا  
 إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ  
 بِمَا كَانَتْ تَعْمَلُ وَ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا  
 يُظْلَمُونَ ﴿۱۳﴾ وَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً  
 يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ

دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ یہ غفلت میں ڈوب چکے ہیں۔ ضرور ہے کہ  
 آخرت میں یہی خسارے میں رہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی  
 وجہ سے) وہ ستارے گئے تو انہوں نے گھبراہچھوڑ دیئے، ہجرت کی، راہ خدا میں سختیاں جھیلیں اور  
 صبر سے کام لیا، ان کے لیے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے (ان سب کا فیصلہ اُس دن ہوگا) جب کہ  
 ہر تنفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور  
 کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہونے پائے گا۔

اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے۔ وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف  
 سے اس کو بفرارغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اُس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا۔

اللہ یہ فقرے ان لوگوں کے بارے میں فرمائے گئے ہیں جنہوں نے راہ حق کو ٹھنسا کر ایمان سے تو بہ کر لی تھی  
 اور پھر اپنی کافر و مشرک قوم میں جا ملے تھے۔

اللہ اشارہ ہے مساجد میں جہش کی طرف۔



فَإِذَا قَامَ اللَّهُ لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿۱۱۷﴾  
 وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ  
 وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴿۱۱۸﴾ فَكُلُوا مِنْهَا سَرَّزِقَكُمْ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا مِمَّا  
 أَشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ آيَاةً تَعْبُدُونَ ﴿۱۱۹﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ  
 عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَالْحَمَّ الْخَنِزِيرِ وَمَا أُهْلَ لِغَيْرِ اللَّهِ

تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔ ان کے پاس ان کی اپنی قوم میں سے ایک رسول آیا۔ مگر انہوں نے اس کو جھٹلادیا۔ آخر کار عذاب نے ان کو آیا جبکہ وہ ظالم ہو چکے تھے۔

پس اے لوگو! اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اُسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی اُسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے مردار اور خون اور سُور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا

۱۱۷ اللہ یہاں جس بستی کی مثال پیش کی گئی ہے اس کی کوئی نشان دہی نہیں کی گئی۔ نہ مفسرین یہ تعبیر کر سکے ہیں کہ یہ کونسی بستی ہے۔ بظاہر ابن عباسؓ ہی کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خود کٹے کو نام لے کر بستی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت میں خوف اور بھوک کی مصیبت کے چھا جانے کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد وہ قحط ہو گا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ایک مدت تک اہل مکہ پر مسلط رہا۔

۱۱۸ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سور سے کے نزول کے وقت وہ قحط ختم ہو چکا تھا جس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔

۱۱۹ یعنی اگر واقعی تم اللہ کی بندگی کے قائل ہو، جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، تو حرام و حلال کے خود مختار نہ بنو۔ جس رزق کو اللہ نے حلال و طیب قرار دیا ہے اسے کھاؤ اور شکر کرو۔ اور جو کچھ اللہ کے قانون میں حرام و نجس ہے اس سے پرہیز کرو۔

يَهٗ فَمِنْ اَضْطَرٍّ غَيْرٍ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾  
 وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكٰذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَهٰذَا  
 حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلٰى اللّٰهِ الْكٰذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلٰى  
 اللّٰهِ الْكٰذِبَ لَا يُعْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۙ وَلَهُمْ عَذَابٌ  
 اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَمْنَا مَا قَصَبْنَا عَلَيْكَ

ہو۔ البتہ بھوک سے مجبور ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھائے، بغیر اس کے کہ وہ قانونِ الہی کی خلاف ورزی کا خواہش مند ہو یا حد ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو، تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔ دنیا کا عیش چند روزہ ہے۔ آخر کار ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

وہ چیزیں ہم نے خاص طور پر یہودیوں کے لیے حرام کی تھیں جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے

۱۱۵ یہ حکم سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۷۳، سورہ مائدہ آیت نمبر ۱۰۷ اور سورہ انعام آیت نمبر ۱۴۵ میں بھی گور چکا ہے۔

۱۱۶ یہ آیت صاف تصریح کرتی ہے کہ خدا کے سوا تحلیل و تحریم کا حق کسی کو بھی نہیں، یا بالفاظ دیگر قانون ساز صرف

اللہ ہے۔ دوسرا جو شخص بھی جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنے کی جرأت کرے گا وہ اپنی حد سے تجاوز کرے گا، الٹا یہ کہ وہ قانون الہی کو سد مان کر اس کے فرامین سے استنطاق کرتے ہوئے یہ کہے کہ فلاں چیز یا فلاں فعل جائز ہے اور فلاں ناجائز۔

اسی خود مختار تحلیل و تحریم کو اللہ پر جھوٹ اور افترا اس لیے فرمایا گیا کہ جو شخص اس طرح کے احکام لگاتا ہے اس کا

یہ فعل دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ جسے وہ کتاب الہی کی سند سے بے نیاز ہو کر جائز

یا ناجائز کہہ رہا ہے اسے خدا نے جائز یا ناجائز ٹھہرایا ہے۔ یا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ نے تحلیل و تحریم کے اقتیارات سے

دست بردار ہو کر انسان کو خود اپنی زندگی کی شریعت بنانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ان میں سے جو دعویٰ بھی وہ کرے وہ

لامحالہ جھوٹ اور اللہ پر افترا ہے۔

۱۱۷ یہ پورا پورا اگر ان اعتراضات کے جواب میں ہے جو مذکورہ بالا حکم پر کیے جا رہے تھے۔ کفار

مِنْ قَبْلُ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۸﴾  
 ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا الشُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا  
 مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا

کر چکے ہیں۔ اور یہ ان پر ہمارا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ہی ظلم تھا جو وہ اپنے اوپر کر رہے تھے۔ البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ اصلاح کے بعد تیرا رب

مکہ کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں تو اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں جن کو تم نے حلال کر رکھا ہے ساگرہ شریعت خدا کی طرف سے تھی تو تم خود اس کی خلاف ورزی کر رہے ہو سا اور اگر وہ بھی خدا کی طرف سے تھی اور یہ تمہاری شریعت بھی خدا کی طرف سے ہے تو دونوں میں یہ اختلاف کیسا ہے؟ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں سب کے حرامت کا جو قانون تھا اس کو بھی تم نے اڑا دیا ہے۔ یہ تمہارا اپنا خود مختار فعل ہے یا اللہ ہی نے اپنی دو شریعتوں میں دو متضاد حکم دے رکھے ہیں؟

۱۸ اشارہ ہے سورۃ انعام کی آیت وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ، الْآیة (آیت نمبر ۱۱۸)

کی طرف، جس میں بتایا گیا ہے کہ یہودیوں پر ان کی نافرمانیوں کے باعث خصوصیت کے ساتھ کون کونسی چیزیں حرام کی گئی تھیں۔

اس جگہ ایک اشکال پیش آتا ہے۔ سورۃ نحل کی اس آیت میں سورۃ انعام کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ انعام اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ لیکن ایک مقام پر سورۃ انعام میں ارشاد ہوا ہے کہ وَمَا كُنْتُمْ اَلَّا تَأْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاَقْدَقَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْنَا اَلَّا تَكْفُرُوْا (آیت نمبر ۱۱۹) اس میں سورۃ نحل کی طرف صاف اشارہ ہے، کیونکہ مکی سورتوں میں سورۃ انعام کے سوا بس ہی ایک سورۃ ہے جس میں حرام چیزوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کونسی سورۃ پہلے نازل ہوئی تھی اور کونسی بعد؟ ہمارے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ پہلے سورۃ نحل نازل ہوئی تھی جس کا حوالہ سورۃ انعام کی مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے۔ بعد میں کسی موقع پر کفار مکہ نے سورۃ نحل کی ان آیتوں پر وہ اعتراضات وارد کیے جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس وقت سورۃ انعام نازل ہو چکی تھی۔ اس لیے ان کو جواب دیا گیا کہ ہم پہلے، یعنی سورۃ انعام میں بنا چکے ہیں کہ یہودیوں پر چند چیزیں خاص طور پر حرام کی گئی تھیں۔ اور چونکہ یہ اعتراض سورۃ نحل پر کیا گیا تھا اس لیے اس کا جواب بھی سورۃ نحل ہی میں جملہ مغفرت کے طور پر درج کیا گیا۔

لَغْفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۱۱۹ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا  
وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝۱۲۰ شَاكِرًا إِذْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَهُدًى  
إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۱۲۱ وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۝ وَإِنَّهُ  
فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝۱۲۲ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ  
اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۝ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝۱۲۳

اُن کے لیے غفور اور رحیم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا، اللہ کا  
سطحِ فرمان اور یک سو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو  
منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ دنیا میں اس کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں  
ہو گا۔ پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ ایک سو ہو کر ابراہیم کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

۱۱۹ یعنی وہ اکیلا انسان بچا، محمد ایک امت تھا۔ جب دنیا میں کوئی مسلمان نہ تھا تو ایک طرف وہ اکیلا اسلام  
کا علمبردار تھا اور دوسری طرف ساری دنیا کفر کی ظلمت دار تھی۔ اُس اکیلے بندے خدا نے وہ کام کیا جو ایک امت کے کرنے  
کا تھا۔ وہ ایک شخص نہ تھا بلکہ ایک پورا ادارہ تھا

۱۲۰ یہ مترضین کے پہلے اعتراض کا مکمل جواب ہے۔ اس جواب کے دو اجزاء ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی شریعت  
میں تضاد نہیں ہے، جیسا کہ تم نے یہودیوں کے مذہبی قانون اور شریعت محمدی کے ظاہری فرق کو دیکھ کر گمان کیا ہے، بلکہ دراصل  
یہودیوں کو خاص طور پر ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں چند نعمتوں سے محروم کیا گیا تھا جن سے دوسروں کو محروم  
کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام  
کا طریقہ ہے اور نہیں معلوم ہے کہ ملت ابراہیمی میں وہ چیزیں حرام نہ تھیں جو یہودیوں کے ہاں حرام ہیں۔ مثلاً یہودی اونٹ  
نہیں کھاتے، مگر ملت ابراہیمی میں وہ حلال تھا۔ یہودیوں کے ہاں شتر مرغ، بٹ، خرگوش وغیرہ حرام ہیں، مگر ملت ابراہیمی میں  
یہ سب چیزیں حلال تھیں۔ اس جواب کے ساتھ ساتھ کفار مکہ کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا گیا کہ نہ تم کو ابراہیم سے کوئی واسطہ ہے  
نہ یہودیوں کو، کیونکہ تم دونوں ہی مشرک کر رہے ہو۔ ملت ابراہیمی کا اگر کوئی صحیح پیر ہے تو وہ یہ نبی اور اس کے ساتھی ہیں جن کے  
عقائد و اعمال میں مشرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔



إِنَّمَا جَعَلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اِخْتَلَفُوا فِيهِ وَإِنَّ رَبَّكَ  
لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۵۲۱﴾  
إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ

رہا سبت، تو وہ ہم نے ان لوگوں پر تسلط کیا تھا جنہوں نے اس کے احکام میں اختلاف کیا،  
اور یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان سب باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے  
رہے ہیں۔

اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے

۵۲۱ یہ کفار مکہ کے دوسرے اعتراض کا جواب ہے۔ اس میں یہ بیان کرنے کی حاجت نہ تھی کہ سبت بھی یہودیوں  
کے لیے مخصوص تھا اور طست ابراہیمی میں حرمت سبت کا کوئی وجود نہ تھا، کیونکہ اس بات کو خود کفار مکہ بھی جانتے تھے۔ اس لیے  
صرف اتنا ہی اشارہ کرنے پر اکتفا کیا گیا کہ یہودیوں کے ہاں سبت کے قانون میں جو سختیاں تم پاتے ہو یہ ابتدائی حکم میں نہ تھیں بلکہ  
یہ بعد میں یہودیوں کی شرارتوں اور احکام کی خلاف ورزیوں کی وجہ سے ان پر عائد کر دی گئی تھیں۔ قرآن مجید کے اس اشارے  
کو آدمی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ ایک طرف بائبل کے ان مقامات کو نہ دیکھے جہاں سبت کے احکام بیان ہوئے  
ہیں (مثلاً ملاحظہ ہو خروج باب ۲۰، آیت ۸ تا ۱۱۔ باب ۲۳، آیت ۱۲ و ۱۳۔ باب ۳۱، آیت ۱۲ تا ۱۷۔ باب ۳۵،  
آیت ۲ و ۳۔ گنتی باب ۱۵، آیت ۳۲ تا ۳۶)، اور دوسری طرف ان جساتوں سے واقف نہ ہو جو یہودی  
سبت کی حرمت کو توڑنے میں ظاہر کرتے رہے (مثلاً ملاحظہ ہو بریسہ باب ۱۷، آیت ۱۲ تا ۲۰۔ حزقیل ایل باب ۲۰،  
آیت ۲ تا ۲۴)۔

۵۲۲ اے نبی دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔ ایک حکمت۔ دوسرے عمدہ نصیحت۔

حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت  
استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جائے  
جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس  
کے دل و دماغ کی گراہیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے  
بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ براہیوں اور گراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان

بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ  
 وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۳۵﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ  
 مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ﴿۱۳۶﴾ وَ  
 اصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ  
 فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۱۳۷﴾ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا

مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے  
 بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر  
 زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ اے محمدؐ صبر سے  
 کام کیے جاؤ۔ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج  
 نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں

کی فطرت میں ان کے لیے جو پیدا کشتی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی اُبھارا جائے اور ان کے بُرے نتائج کا خوف دلایا جائے۔  
 ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔  
 دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے دل سوزی اور تیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے  
 حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے۔ بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے  
 لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ تحقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔

۱۳۳ یعنی اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی جنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور  
 الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصد حریفِ مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے  
 ڈنکے بجا دینا نہ ہو۔ بلکہ اس میں شبیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگنے والے ہوں۔ مخاطب  
 کے اندر ضد اور بات کی بیج اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے  
 کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گمراہی میں  
 اور زیادہ دور نہ نکل جائے۔

وَالَّذِينَ هُمْ يُحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾

اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔ ع

۱۲۸ یعنی جو فضلا سے ڈر کر ہر قسم کے بڑے طریقوں سے پرہیز کرتے ہیں اور ہمیشہ نیک اور متبرہ پر قائم رہتے ہیں۔ دوسرے ان کے ساتھ خواہ کتنی ہی برائی کریں، وہ ان کا جواب برائی سے نہیں بلکہ بھلائی ہی سے دینے

جاتے ہیں\*۔

